ذکرِ غالب

مالک رام ایم اے

ذکرِ غالب

از

مالک رام ایم۔ اے

مکتبہ جامعہ

بار اول ایکہزار — دہلی - نئی دہلی - لاہور — قیمت ۸؍

سنہ ۱۹۳۸ء

قطعه

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم   /   لاجرم در نسبِ فره‌مندیم

ترک زادیم و در نژاد همے   /   بہ سترگانِ قوم پیوندیم

ایبکیم از جماعۂ اتراک   /   در تمامی ز ماہ دہ چندیم

فنِ آبائے ما کشاورزیست   /   مرزبان زادۂ سمرقندیم

ورز معنی سخن گزاردہ   /   خود چہ گوییم تا چہ و چندیم

فیضِ حق را کمینہ شاگردیم   /   عقلِ کل را بہینہ فرزندیم

ہم بتابش ببرق ہمنفسیم   /   ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم

بہ تلاشیکہ ہست فیروزیم   /   بہ معاشیکہ نیست خرسندیم

ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم

ہمہ بر روزگار می خندیم

دیباچہ

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ظاہر ہے کہ اپنے اس مقطع میں میرزا صاحب نے شاعرانہ انکسار سے کام لیا ہے جسے تعلّی کہتے ہیں۔ ارباب نظر کے حلقوں میں وہ اپنی زندگی ہی میں مشہور اور مقبول ہو چکے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ قبولِ عام انہیں ایک مدت تک حاصل نہیں ہوا۔ غالبؔ کے کلام کی صحیح قدر عام لوگوں کو اس وقت معلوم ہوئی جب مولانا حالیؔ نے یادگارِ غالب لکھکر ان کے مذاقِ شعر کو بدل دیا۔ انگریزی خوانوں میں غالبؔ کا چرچا زیادہ تر بجنوری مرحوم کے مقدمے اور دیوانِ غالبؔ کے برلن اور چغتائی اڈیشنوں کی بدولت ہوا۔

پچھلے سال ادبِ غالب میں دو گراں قدر کتابوں کا اضافہ ہوا۔ جنابِ مہرؔ نے "غالب" اور محمد اکرام صاحب نے "غالب نامہ" تصنیف کر کے اس کام کی تکمیل کردی جسے مولانا حالیؔ نے شروع کیا تھا۔

تاہم ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو جامع بھی ہو اور مختصر بھی تاکہ وہ لوگ جو ذوقِ ادب بہت مگر مال دنیا کم رکھتے ہیں۔ غالب شناسی سے محروم

نہ رہیں شکر ہے کہ مالک رام صاحب نے اس کمی کو بہت خوبی سے پورا کر دیا۔ ان کی کتاب "ذکرِ غالب" اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے اور اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات بہ حساب سنین ترتیب دیئے گئے ہیں، جس سے پڑھنے والوں کو بہت سہولت ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مالک رام صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے بہت سی نئی معلومات بھی حاصل کی ہے، مثلاً غالب کے بزرگوں کے متعلق بعض تفصیلات، ان کی ہمشیرہ کا حال، عارف اور ان کے دونوں بیٹوں کے حالات، غدر کے سلسلے میں سکے کا اصلی واقعہ، میرزا صاحب کو ملک الشعراء بنانے کی تجویز، وغیرہ وغیرہ۔

میرزا صاحب کی ایک نئی تصویر اور ان کے آگرے والے مکان کے فوٹو نے کتاب کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب بہت بڑے حلقے میں اشاعت حاصل کرے گی، اور مالک رام صاحب کو باوجود ان کی عزلت پسندی کے "ظہوری کے مقابل میں خفائی" نہ رہنے دے گی۔

سید عابد حسین

جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی



ذکرِ غالب

خاندان میرزا غالب نے کئی جگہ لکھا ہے کہ میرا سلسلہ نسب تور ابنِ فریدوں سے ملتا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مختصراً ان کے خاندان کے حالات لکھے جائیں۔

دنیا کے تمام ممالک کی ابتدائی تاریخ پر دیومالا کے ایسے گہرے پردے پڑے ہیں کہ اس میں سے افسانہ وحقیقت کو الگ الگ کرنا ناممکن ہے۔ ایران بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ مورخین نے یہاں کے شاہی خاندانوں کو ابتدائے عالم سے یزدگرد ساسانی تک پانچ سلسلوں میں تقسیم کیا ہے۔ آبادی۔ جیئی۔ شائی۔ یاسائی اور گلشائی۔ ان میں سے پہلے چار کے متعلق ہمارا علم بہت محدود ہے اور جو کچھ ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔ البتہ جب ہم پانچویں سلسلہ یعنی گلشائیوں تک پہنچتے ہیں۔ تو اس اندھیرے میں کچھ اجالا نظر آنے لگتا ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا بھی اجالے سے زیادہ اندھیرے ہی میں ہے۔

گلشائی سلسلہ چار گروہوں پر مشتمل ہے۔ اول پیشدادی۔ دوم کیانی سوم اشکانی اور چہارم ساسانی۔ ساسانی گروہ کا آخری بادشاہ یزدگرد تھا۔ جس کو مسلمانوں نے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے عہد میں قادسیہ کے مقام پر شکست فاش دی، اور

اس کے بعد ایران بھی اسلامی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ گروہِ اول یعنی پیشدادی میرزا غالب کے آباء و اجداد ہیں۔

پیشدادی خاندان کا بانی کیومرس تھا۔ ایرانی اسے نبی بھی مانتے ہیں۔ جشنِ سدہ کا بانی وہی ہے اور شہر بلخ بھی اسی کی یادگار ہے۔ اس کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ پورِ سیامک تخت پر بیٹھا۔ ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ شہر شوش اور بابل کی بنیاد ہوشنگ نے رکھی اگرچہ ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ بابل کی بنیاد ضحاک کے زمانہ میں پڑی۔ ہوشنگ کا جانشین تہمورس تھا۔ اور اس کے بعد جمشید وسادہ آرائے سلطنت ہوا۔ جشنِ نوروز کی ابتداء اسی کے زمانہ سے ہے اور کہتے ہیں کہ شرابِ انگور بھی اسی کی ایجاد ہے۔ جامِ جم کو تو ہمارے شاعروں نے حیاتِ جاودانی بخش دی ہے۔ جمشید کے آخری ایام میں ایک شخص ضحاک نے خروج کیا اور جمشید کو آرہ سے دو نیم کر کے ہلاک کر دیا۔ مگر خود اتنا ظالم اور شقی تھا کہ جلد ہی خلقِ خدا اس سے تنگ آگئی۔ آخر لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اس کی جگہ جمشید کے پوتے فریدوں ابنِ آبتین کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ ممکن نہیں کہ فریدوں کا نام آئے اور اس کے ساتھ کاوہ آہنگر اور اس کا درفشِ کاویانی ذہن میں نہ آئیں۔ یہی فریدوں میرزا غالب کا جدِ اعلیٰ ہے۔

فریدوں کے تین بیٹے تھے۔ ایرج۔ تہمورس کی صاحبزادی ایران دخت کے بطن سے اور تور اور سلم دو بھائی ضحاک کی بیٹی سے۔ اس نے سلطنت تین حصوں میں تقسیم کر دی۔ مرکزی علاقہ سب سے بڑے بیٹے ایرج کے حصہ میں آیا۔ مشرقی اضلاع تور کو ملے اور مغربی سلم کو۔ تور اور سلم اس تقسیم سے ناخوش تھے۔ رشک و حسد نے

اپنا کام کیا اور دونوں بھائیوں نے سازش کر کے ایرج کو قتل کر دیا۔ مگر دل کی مراد پھر بھی بر نہ آئی۔ فریدوں نے اپنے بعد تخت نشینی کے لئے ایرج کے بیٹے منوچہر کو نامزد کیا۔ زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی منوچہر نے اپنے والد کے قاتلوں سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ تور اور سلم کے لئے سرزمینِ ایران اپنی تمام وسعت اور پہنائی کے باوجود تنگ ہوگئی۔ اب یہاں رہنا گویا اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ آخر ان لوگوں نے کہیں اور قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تلوار ہاتھ میں تھی اور نصیبا یاور۔ لڑتے بھڑتے یہ جماعت ترکستان پہنچی اور وہاں ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ تور کی نسل سے ایک شخص افراسیاب[1] نے منوچہر کو شکست دی۔ مگر پھر صلح صفائی ہوگئی اور یہ طے پایا کہ دریائے آمو یہ دونوں حکومتوں میں حدِ فاصل رہے۔ منوچہر کی زندگی تک تو فریقین نے اس عہدنامہ کی پابندی کی۔ مگر جب اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا نوذر تخت نشین ہوا۔ تو افراسیاب نے پھر ایران پر حملہ کر دیا اور اب کے تخت پر بھی قابض ہوگیا۔ دس بارہ برس کے بعد ایرانیوں نے علمِ بغاوت بلند کیا اور آخری بار تورانیوں کو ایران سے نکال دیا۔ اگرچہ دونوں خاندانوں میں جنگ کا سلسلہ اس کے بعد بھی مدت تک جاری رہا۔

تورانیوں پر بھی کئی انقلاب آئے۔ زمانہ نے کئی بار ان کی بساط الٹی اور کئی بار انہوں نے اپنی ہمت اور استقلال سے اسے ازسرِنو بچھایا۔ آخری بار افراسیاب کی نسل سے ترکانِ ایبک نے خراسان و عراق و پارس و آذربائیگان میں بویہ اور غزنویہ کے کھنڈروں پر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور خاندان سلاجقہ کے نام سے

---

[1] افراسیاب ابنِ پشنگ ابنِ زادشم ابنِ تور ابنِ فریدوں ؎

مشہور ہوئے۔ آلِ سلجوق نے بھی ایک صدی تک (۱۰۶۳ء لغایت ۱۱۵۷ء) داد و دہش سے حکومت کی۔ آخر خوارزمیوں کے ہاتھوں سلجوقیوں کا شیرازہ بھی بکھرا اور یہ لوگ ماورالنہر میں پراگندہ ہو گئے۔ انہیں میں سے سلطان زادہ ترسم خاں نے سمرقند میں اقامت اختیار کی[51]۔ یہ ترسم خاں غالباً میرزا غالب کے پردادا تھے۔

افسوس کہ میرزا غالب کے دادا کا نام کسی طرح معلوم نہیں ہو سکا۔ بہرحال وہ اپنے باپ سے ناراض[52] ہو کر محمد شاہ رنگیلے کے عہد[53] میں سمرقند سے واردِ ہندوستان ہوئے۔ ان کی زبان یکسر ترکی تھی۔ ہندوستانی بالکل برائے نام جانتے تھے[54]۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک بہادر کی ملازمت میں داخل ہوئے[55]۔ نواب معین الملک کی وفات پر وہ لاہور سے دہلی پہنچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ نواب ذوالفقار الدولہ ہی کے توسل سے وہ شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے[56]۔ ایک سیر حاصل پرگنہ پہاسو ان کی ذات اور رسالہ کی تنخواہ کے لئے مقرر ہوا[57]۔ اور یوں آرام سے بسر ہونے لگی۔

ع۵۱ درفش کاویانی صفحہ ۵۴

ع۵۲ کلیات نثر فارسی (غالب) صفحہ ۴۲ (خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

ع۵۳ غالب (مہر) صفحہ ۹

ع۵۴ درفش کاویانی صفحہ ۵۴

ع۵۵ کلیات نثر فارسی صفحہ ۴۲

ع۵۶ اردوئے معلی صفحہ ۲۶

ع۵۷ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۳۰

ان کی اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں ۔ میرزا غالب منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھتے ہیں عله:-

"بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی ۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے ۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا ۔ اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ان کے والد چار بھائی اور تین بہنیں تھیں ۔ تین بہنوں کی تصدیق اس شقہ سے بھی ہوتی ہے ۔ جو میرزا کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ۷ جون ۱۸۰۶ء کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کی تقسیم کے لئے لکھا گیا تھا ۔ اس میں دوسرے حصہ داروں کے ساتھ پندرہ سو روپیہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنوں کے لئے مقرر ہوئے تھے ۔ لیکن ہمیں ان میں سے صرف دو صاحبزادوں کے نام معلوم ہیں ۔ میرزا عبداللہ بیگ خاں اور میرزا نصر اللہ بیگ خاں ۔ یہی میرزا عبداللہ بیگ خاں میرزا غالب کے والد بزرگوار ہیں ۔

والدین اور ننہیال میرزا عبداللہ بیگ خاں کی ولادت شاہ جہان آباد میں ہوئی عله ۔ جب تک والد کا سایہ سر پر تھا ۔ انہیں

عله یادگار غالب صفحہ ۱۶۷

عله کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰ (خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

بعد دنیا کی فکر تھی نہ اپنی معاش کی۔ مگر جونہی ان کا انتقال ہوا اور سلطنت مغلیہ میں بھی طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ تو انہیں بھی معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ میرزا غالب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں [عہ۱]:-

"دادا کے انتقال کے بعد جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا۔ وہ علاقہ (یعنی جاگیر پرگنہ پہاسو) نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا"

میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی [عہ۲]۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور خانگی معاملات میں

عہ۱ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶

عہ۲ زمانہ (کانپور) جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۶۔ زمانہ کی اس اشاعت میں ایک مضمون چھپا ہے۔ جس میں غالب کے ایک خط کی نقل ہے۔ اصل خط مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ کے کتب خانہ (حبیب گنج) میں محفوظ ہے۔ یہ خط غالب نے آگرہ کے دو شخصوں خداداد خاں صاحب اور ان کے بیٹے ولی داد خاں صاحب کے نام لکھا تھا۔ اس خاندان کے میرزا غالب کی ننھیال کے ساتھ لین دین کے تعلقات تھے۔ میرزا غالب اس خط میں لکھتے ہیں کہ چونکہ والدہ صاحبہ (باقی صفحہ ۱۱ کے نیچے ملاحظہ فرمائیں)

بذات خود خاص دلچسپی لیتی تھیں۔ خواجہ غلام حسین خاں کمیدان سرکار میرٹھ کے ایک فوجی افسر اور آگرہ کے عمائدین میں سے تھے۔ آگرہ میں ان کی وسیع املاک تھیں جن کا ذکر خود میرزا غالب نے بھی ایک خط میں کیا ہے۔ وہ منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:۔ [۱]

" ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازہ کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک گٹھیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

یہ بڑی حویلی جس کے صدر دروازہ کی بارہ دری پر میرزا کی نشست رہتی تھی اب بھی آگرہ میں موجود ہے۔ اسی کا نام کالا (کلاں ؟) محل ہے۔ یہ نہایت عالی شان عمارت ہے، میرا خیال ہے کہ میرزا کی پیدائش اسی مکان میں ہوئی ہوگی، کیونکہ خواجہ غلام حسین خاں صاحب کا اصل سکونتی مکان یہی تھا۔ آج کل اس میں لڑکیوں کا اسکول ہے۔ اس کے علاوہ جس جائداد کے نام اس مکتوب میں آئے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰)

خود لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ اس لئے جب تک کوئی تحریر ان کی دستخطی اور مہری نہ ہوگی "پایۂ اعتبار سے ساقط متصور" ہوگی۔ خط کی تاریخ میں کچھ اشتباہ ہے۔ میرے خیال میں یہ خط ۱۸۲۴ء کا ہے۔ اس پر میرزا غالب کی جو مہر ہے۔ وہ ۱۲۳۱ھ (مطابق ۱۸۱۶ء) کی تیار شدہ ہے۔

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶۴

اس میں سے بہت سی تا حال اسی طرح موجود ہے جیسی غالب کے بچپن کے زمانہ میں تھی۔

میرزا عبداللہ بیگ خاں اپنی سسرال میں "میرزا دولھا" کے عرف سے مشہور تھے۔ ان کی حیثیت اپنی سسرال میں غالباً خانہ داماد کی تھی۔ کیونکہ ان کی بیوی آخر تک اپنے میکے ہی میں رہیں۔ یوں بھی میرزا عبداللہ بیگ خاں کا اپنا کوئی مستقل مستقر تو تھا نہیں۔ جہاں وہ جاتیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ ان کی وفات راؤ راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور کی ملازمت میں ہوئی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:[۵۱]

"راجہ بختاور سنگھ نے ابھی ان کو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انہیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے۔ جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لئے بھیجی گئی، اس کے ساتھ میرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ان کے گولی لگی اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا اور راجگڑھ میں دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گاؤں بیسر حاصل اور کسی قدر روزینہ میرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا۔ جو ایک مدت دراز تک جاری رہا"

یہ حادثہ ۱۸۰۲ء میں پیش آیا۔[۵۲] میرزا عبداللہ بیگ خاں کی قبر کم از کم ۱۸۶۰ء تک راج گڑھ میں موجود تھی۔ میرزا نے اسی سال جو قصیدہ راجہ شیودھیان سنگھ والیٔ الور کی مدح میں کہا تھا۔ اس میں اپنے حقوق جتانے کے لئے یہ شعر

---

۵۱ یادگارِ غالب صفحہ ۱۱

۵۲ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲

بھی لکھا ہے ؎

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست　　در خاکِ راج گڑھ پدرم را بود مزار

سن ولادت

میرزا غالب کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ؁[عل۱] (مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء؁) کو شہر آگرہ[ع۲] میں ہوئی۔ ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ اگرچہ وہ مشہور اسد اللہ خاں کے نام سے ہوئے۔ ان کے والد کا عرف "میرزا دولھا" تھا۔ ان کا عرف "میرزا نوشہ" ہوا۔ ان سے ایک بڑی بہن تھیں۔ جن کا نام یا عرف چھوٹی خانم صاحبہ تھا[ع۳]۔ اور ایک بھائی میرزا یوسف بیگ خاں تھے جو ان سے

عل۱ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۵

ع۲ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۷ درفش کاویانی صفحہ ۱۳۱

ع۳ چھوٹی خانم صاحبہ کی شادی قوم برلاس کے ایک شخص میرزا جیون بیگ بدخشی کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے ہوئی۔ غزلیات وحشی کے دیباچہ نگار (صفحہ ۳) کو غلط فہمی ہوئی ہے جو انھوں نے لکھا ہے کہ میرزا جیون بیگ کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے غالب کی پھوپھی کا نکاح ہوا تھا۔ دراصل یہ حقیقی بہن تھیں۔ ہاں میرزا غالب کی ایک پھوپھی کی شادی برلاس قبیلہ کے ایک اور شخص مبارک علی بیگ سے ہوئی تھی۔ اور ان کی بیٹی موتی بیگم کا نکاح ایک شخص اکبر علی بیگ سے ہوا۔ جو زمانۂ غدر میں آگرہ کے کوتوال تھے۔ ان کی اولاد آگرہ میں اب بھی موجود ہے۔ اب اس خاندان کے بزرگ ترین شخص مرزا بنیاز علی بیگ عرف نواب مرزا ہیں۔ جو اکبر علی بیگ کے پوتے اور دلدار علی بیگ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت ۸۰ سال ہے۔

یہ میرزا جیون بیگ بھی میرزا غالب کے دادا کے ساتھ بدخشاں سے ہندوستان آئے تھے۔ اور دونوں خاندانوں میں پہلے سے دوستانہ تعلقات (باقی صفحہ ۱۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

دو برس چھوٹے تھے۔ میرزا غالبؔ نے اپنی والدہ کے علاوہ اپنی ممانی کا بھی دودھ پیا تھا۔ع۹

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) تھے۔ مرزا اکبر بیگ اور چھوٹی خانم کی اولاد میں تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھی۔ صاحبزادوں کے نام مرزا عاشور بیگ، مرزا مغل بیگ اور مرزا عباس بیگ تھے، اور صاحبزادی کا نام امانی خانم تھا۔ غالبؔ کے اردو خطوط میں ان تینوں بھانجوں کا ذکر ہے۔ مرزا عاشور بیگ غدر میں اپنے ۱۹ سالہ بیٹے مرزا احمد بیگ کے ساتھ شہید ہوئے۔ (اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۵) مرزا مغل بیگ کی قبر مہندیوں میں شاہ عبدالعزیزؒ کے مزار کی جنوبی دیوار کے قریب ہے۔ مرزا عباس بیگ عرصہ تک سرکار انگریزی میں ملازم رہے۔ غدر کے ایام میں وہ بلگرام میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اسکے بعد تبدیل ہو کر فرخ آباد گئے۔ (عودِ ہندی ص۷) اور پھر ایک عرصہ تک لکھنؤ میں رہے۔ امانی خانم کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے صاحبزادے مرزا علی بخش خاں رنجور سے ہوئی تھی۔ جن کے صاحبزادے غلام فخرالدین سے غالبؔ کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی صاحبزادی عزیز النسا بیگم منسوب تھیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے ایک نہایت اعلیٰ پایہ کا مضمون خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مترجم بوستان خیال کے متعلق رسالہ اردو (دکن) کی اشاعت اپریل ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا۔ یہ انکے مجموعہ مضامین کے چوتھے حصہ میں بھی شامل ہے۔ چونکہ خواجہ امان اور میرزا غالبؔ کے اجداد کا سلسلہ ایک ہی ہے۔ اسلئے تمہید میں انھوں نے مرزا غالبؔ کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے مگر اسمیں ان سے واقعات اور سنین کی اتنی فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں کہ اس مختصر تحریر میں انکا شمار کرانا بھی ناممکن ہے۔ جہاں تک خواجہ امان کا تعلق ہے۔ یہ بہترین مضمون ہے اور کیوں نہ ہو۔ لکھنے والے مرزا فرحت اور خواجہ امان ان کے نانا۔ بھلا ان سے بہتر اس موضوع پر کون لکھ سکتا تھا۔ ہاں یاد آیا چھوٹی خانم کے شوہر مرزا اکبر بیگ جناب مرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا مرزا افضل بیگ کے بھائی تھے۔

ع۹ اردوئے معلیٰ ص۲۲۳

چچا کی سرپرستی میرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی دیکھ بھال ان کے چھوٹے بھائی میرزا نصراللہ بیگ خاں کے ذمہ ہوئی۔ میرزا نصراللہ بیگ خاں انگریزی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار تھے۔ ان کی شادی فخرالدولہ دلاورالملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والیٔ لوہارو کی ہمشیرہ سے ہوئی۔ مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی کہ بیوی کی وفات ہوگئی۔ جب میرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات ہوئی تو انہوں نے بھائی کی اولاد کو اسی ناز و نعم سے پالا جیسے ان کی اپنی حقیقی اولاد ہو۔

"انگریزی عملداری کے بعد اکبرآباد کی صوبہ داری کمشنری سے بدل گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوئے" نواب احمد بخش خاں کا انگریزوں کے ہاں اچھا اثر و رسوخ تھا۔ انھوں نے کئی معرکوں میں لارڈ لیک کی نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ لارڈ لیک ان کو مانتے تھے۔ نئے مفتوحہ علاقہ کا جملہ انتظام بھی لارڈ لیک کے ہاتھ میں تھا۔ غرضیکہ نواب احمد بخش خاں نے سفارش کی اور میرزا نصراللہ بیگ خاں چار سو سوار کے ایک دستہ کے رسالہ دار ہوگئے۔ ان کی ذات کے لئے ایک ہزار سات سو روپیہ ماہوار اور رسالہ کی تنخواہ کے لئے اکبرآباد کے مضافات میں سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کے دو پرگنے سونک اور سونسا عین حیات جاگیر میں ملے[۱] اور غالباً حسام الدولہ کا خطاب بھی ملا[۲] مگر فلک ناہنجار کو یہ منظور نہ تھا۔

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶

[۲] کلیات نثر فارسی صفحہ ۴۹ (میرزا موارد الکلم کی تقریظ میں لکھتے ہیں: "من کہ آلِ حسام الدولہ مرحوم" حسام الدولہ ان کے چچا ہی ہو سکتے ہیں)۔

اس اعزاز کو سال بھر بھی مشکل سے ہوا ہوگا کہ ۱۸۰۶ء میں میرزا عبداللہ بیگ خاں کے انتقال کے کم و بیش پانچ سال بعد میرزا نصراللہ بیگ خاں بھی غالباً کسی معرکہ میں کام آئے[۵] اور یوں میرزا غالب اور ان کے بھائی میرزا یوسف ایک بار پھر یتیم و تنہا رہ گئے۔ میرزا غالب کی عمر اس وقت صرف آٹھ برس اور چند ماہ تھی۔

پنشن

نواب احمد بخش خاں کو میرزا نصراللہ بیگ خاں کی جوانا مرگی کا سخت افسوس ہوا۔ انہیں ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر خاص طور پر رحم آیا۔ جو اب چچا کی وفات کے بعد بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ انہوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور وہاں سے پنشن کا انتظام ہوگیا۔ نواب احمد بخش خاں کو اپنی گوناگوں خدمات کے عوض میں سرکار انگریزی کی طرف سے علاقہ میوات میں فیروز پور جھرکہ اور مضافات ہوڈل (تحصیل فیروز پور جھرکہ) میں پونا ہانا وغیرہ کی جاگیریں بطور استمرار عطا ہوئی تھی اور چونکہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے۔ اس لئے مہاراجہ الور نے اپنی طرف سے انہیں لوہارو کا پرگنہ دے دیا تھا جو اس سے پہلے الور ہی کا ایک حصہ تھا۔ فیروز پور جھرکہ کی استمراری جاگیر کے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کے لئے نواب احمد بخش خاں سرکار انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرینگے۔

میرزا نصراللہ بیگ خاں کی وفات پر ان کی جاگیر سونک وسونسا قبضہ سرکار میں چلی گئی۔ اور چار سو سوار کا رسالہ بھی توڑ دیا گیا۔ البتہ ان میں سے پچاس سواروں کا دستہ نواب احمد بخش خاں بہادر (اور نواب نجابت علی خاں بہادر والی جھجر؟) کو دیا گیا کہ وہ اسے برقرار رکھیں۔ سرکار کو جب ضرورت ہوگی۔ وہ ان سے طلب کریگی۔

عـ۵ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲ (خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

س دستہ کی دیکھ بھال کے اخراجات اور میرزا مرحوم کے لواحقین کی امداد کے لئے یہ
نتظام کیا گیا کہ نواب احمد بخش خاں جو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دیتے تھے۔ وہ اس شرط
ر معاف کردئے گئے کہ پندرہ ہزار وہ اس دستہ کی غور و پرداخت پر خرچ کریں۔
ر باقی میرزا مرحوم کے خاندان کو بطور امداد دیں۔ یہ فیصلہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو ہوا۔

نہ معلوم کیسے مگر ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے ایک اور شقہ حاصل
کر لیا۔ جس میں یہ درج تھا۔ کہ میرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے متعلقین کو پانچ ہزار
روپیہ سالانہ حسب ذیل شرح سے ملے[ع۱]

(۱) خواجہ حاجی خاں کو دو ہزار روپیہ سالانہ۔[ع۲]

(۲) میرزا نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنوں کو ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔

اور (۳) میرزا نوشہ اور میرزا یوسف برادرزادگان میرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم
و ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔

ع۱ میں نے اس سے پہلے لکھا ہے کہ میرزا غالب کی ہمشیرہ چھوٹی خانم صاحبہ ان سے بڑی
تھیں۔ میں نے وہ استدلال اسی شقہ سے کیا ہے۔ کیونکہ اس شقہ میں پنشن کے حصہ داروں میں
چھوٹی خانم صاحبہ کا کوئی ذکر نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسوقت انکی شادی ہو چکی تھی۔ اگر وہ میرزا
غالب سے دو برس بھی بڑی ہوں جو بعید از قیاس نہیں۔ تو ۱۸۰۶ء میں انکی عمر گیارہ برس
کی ہوگی۔ اور اس عمر میں شادی ہو جانا غیر ممکن نہیں۔ خود جب میرزا غالب کی شادی ہوئی ہے۔
انکی بیوی کی عمر صرف گیارہ برس تھی اور ان کی اپنی تیرہ برس کی۔

ع۲ خواجہ حاجی خاں کا ذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا کہ یہ کون بزرگوار تھے۔
فی الحال اتنا کافی ہے کہ یہ ان پچاس سواروں کے افسر تھے جو چارسو کا بقیہ تھے۔

گویا پہلے تو دس ہزار سالانہ کے ہوئے پانچ ہزار سالانہ اور پھر اس تقسیم کی رو سے پانچ ہزار میں سے بھی صرف ساڑھے سات سو میرزا غالب کو ملے اور ساڑھے سات سو ان کے بھائی میرزا یوسف کو۔

تعلیم میرزا غالب کی ابتدائی تعلیم کے متعلق ہمیں بہت کم واقفیت ہے۔ مگر اس امر کے لئے کافی دلائل وشواہد موجود ہیں کہ ان کی تعلیم کی طرف سے بے توجہی نہیں برتی گئی۔ ان کی تحریرات میں ہیئت۔ نجوم۔ منطق۔ فلسفہ۔ طب موسیقی اور تصوف کی اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان علوم میں مبصرانہ نظر رکھتے تھے۔ چونکہ والد اور چچا کی وفات کے بعد ان کا قیام اپنی ننہیال میں رہا۔ اور ان لوگوں کا تمول معلوم ہے۔ اس لئے امید کی جاسکتی ہے۔ کہ انہوں نے اپنی حیثیت کے مطابق میرزا کی تعلیم وتربیت کا مناسب انتظام کیا ہوگا۔

اس زمانہ میں مولوی محمد معظم صاحب کی ہستی آگرہ میں مرجع خاص وعام تھی۔ میرزا غالب نے بھی ابتدائی فارسی تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ اور ایک عرصہ تک ان سے کسب فیض کیا۔ ؎ مولانا حالی مرحوم نے ایک دلچسپ واقعہ اس زمانہ کا لکھا ہے۔ کہ میرزا غالب نے ایک فارسی غزل میں یعنی 'چہ' کی جگہ 'کہ چہ' ردیف لکھی اور اپنے استاد کو دکھائی۔ مولوی محمد معظم صاحب نے ردیف کو مہمل کہہ دیا۔ مگر جب تھوڑے دن بعد میرزا غالب نے ظہوری کے کلام سے اس کی سند پیش کی تو وہ اپنے ہونہار شاگرد کی خداداد ذہانت اور جدّت کے قایل ہوگئے۔ میرزا غالب کے اردو اور فارسی کلام میں ایسی متعدد غزلیں ہیں جن سے علم عروض پر ان کی قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔

؎ تذکرہ عیار الشعرا (خوب چند ذکا) بحوالہ غالب نامہ صفحہ ۱۷، یادگار غالب صفحہ ۱۳

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرزا غالب کو زبان فارسی سے قدرتی لگاؤ تھا۔ مگر اس ذوق کو چمکایا ملا عبدالصمد ایرانی نے۔ جیسا کہ میرزا نے خود لکھا ہے ملا عبدالصمد ایک یزد کے رہنے والے امیرزادہ جلیل القدر ساسان پنجم کی نسل سے تھے [۱] اسلام اختیار کرنے سے پہلے ان کا نام ہرمزد تھا۔ وہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں سیر و سیاحت کرتے ہندوستان آگئے اور وارد اکبرآباد ہوئے۔ میرزا غالب کی عمر اس وقت چودہ برس تھی۔ میرزا نے انہیں اپنے پاس ٹھیرایا اور دو برس تک ان سے علم حاصل کیا [۲]۔ ملا عبدالصمد کی مادری زبان فارسی تھی۔ اسلام لانے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے موبد تھے۔ زردشتیوں کا تمام مذہبی ذخیرہ قدیم فارسی میں ہے۔ اس لئے ان کا فارسی زبان کا فاضل اجل ہونا چنداں مقام حیرت نہیں۔ اس کے علاوہ وہ عربی کے بھی عالم متبحر تھے [۳]۔ میرزا کی فارسی دانی کا سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ لیکن اس عمارت کی تکمیل ملا عبدالصمد کے چابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقہ پر ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی۔

ملا عبدالصمد نے ہندوستان سے واپس چلے جانے کے بعد بھی میرزا غالب سے خط و کتابت جاری رکھی [۴]۔ مولانا حالی نے بھی لکھا ہے [۵]:-

"نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے

---

[۱] لطایف غیبی صفحہ ۳۵

[۲] درفش کاویانی صفحہ ۱۳

[۳] تیغ تیز (غالب) صفحہ ۱۳، لطایف غیبی صفحہ ۳۵

[۴] درفش کاویانی صفحہ ۱۰

[۵] یادگار غالب صفحہ ۱۵

مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا "اے عزیز! چہ کسی؟ کہ بایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می گزری۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالصمد کو اپنے شاگرد سے واقعی محبت تھی۔ اور انہوں نے میرزا کی تعلیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہوگا۔ خود میرزا غالب نے بھی اپنی کتابوں میں جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ اور محبت بھرے الفاظ میں ان کی تعلیم و تربیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قاطع برہان کا معرکہ اس امر کی بین شہادت ہے کہ میرزا نے ملا عبدالصمد کی تعلیم سے کس قدر استفادہ کیا تھا۔ وہ نہ صرف خالص فارسی زبان اور اس کی صرف و نحو بلکہ تاریخ ایران اور خصوصاً پارسی مذہب اور اس کے متعلقات پر بھی پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔ ورنہ مکتب میں تو انہوں نے شرح مائۃ عامل جامی تک ہی پڑھا تھا[۱]۔ مسٹر محمد اکرام لکھتے ہیں کہ میرزا کے ایک استاد نظیر اکبرآبادی تھے[۲]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرزا کے بچپن کے زمانہ میں نظیر کا ایک مکتب آگرہ میں تھا لیکن میں اس بیان کی تصدیق نہیں کر سکا کہ میرزا نے ان سے بھی تعلیم پائی ہو۔ میرے خیال میں وہ نظیر کے شاگرد نہیں تھے[۲]۔

نوجوانی کی رنگ رلیاں میرزا غالب کی عمر نو برس سے کم تھی۔ جب ان کے چچا کا انتقال ہوا۔ گویا سر پر کوئی ایسا شخص نہ رہا جو ان کی غور و پرداخت میں دلچسپی لیتا۔ وہ اپنی والدہ کے پاس ننھیال ہی میں رہتے تھے۔ اور وہی ان کے خرچ وغیرہ کی کفیل تھیں۔ ان کے نانا خواجہ غلام حسین خاں

---

[۱] رسالہ ہندوستانی الہ آباد (جنوری ۱۹۳۴ء)

[۲] غالب نامہ (محمد اکرام) صفحہ ۱۵ ۔ [۳] میرزا نے میر اعظم علی صاحب کے مدرسہ میں بھی تعلیم پائی تھی۔

اگرچہ ان کی جوانی تک زندہ تھے[۵۱] مگر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نواسے سے کبھی بازپرس نہیں کی۔ روپیہ پیسہ کی افراط اور آزادی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں اگر غالب بھی اپنے زمانہ کے رئیسوں کی روش کے مطابق راہ سے بھٹک گئے اور لہو ولعب میں پڑ گئے تو کچھ تعجب کا مقام نہیں۔ تعجب تو جب ہوتا اگر وہ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی دامن بچا کر نکل جاتے۔

انہوں نے اس زمانہ کے عیش وعشرت کی طرف اپنی تحریروں میں کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ کہیں فرومایگوں اور اوباشوں کی ہم نشینی کا ذکر ہے کہیں ستم پیشہ ڈومنی کا۔ مگر جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔ اس باب میں ان کا نظریہ مصری کی مکھی کا تھا نہ کہ شہد کی مکھی کا۔ شکر ہے کہ رندی وسیہ مستی کی یہ گھنگور گھٹائیں ۲۴-۲۵ کی عمر سے پہلے ہی اپنا پورا زور دکھا کے ختم ہوگئیں۔ البتہ شراب نوشی کی عادت مرتے دم تک نہ چھوٹی۔

شاعری کی ابتدا ابھی وہ مولوی محمد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر دس برس سے متجاوز نہ تھی[۵۲] کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ اگرچہ اس زمانہ کی ایک فارسی غزل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مگر شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر اردو کی طرف تھی اور وہ بھی بیدل و اسیر و شوکت وغیرہم کے رنگ میں پچیس برس کی عمر تک تقریبًا دو ہزار شعر کا ایک دیوان تیار ہوگیا۔ اگر یہی روش رہتی تو ان کی ادبی موت میں کسے شبہ ہوسکتا تھا۔ مگر الحمد للہ کہ ان کی خداداد صلاحیت نے

---

۵۱ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۴

۵۲ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۱۹ (خط بنام سلطان محمد بہادر میسوری)

ان کی رہنمائی کی۔ انہوں نے یہ راہ ترک کردی اور اس دیوان کو بھی نظری کردیا۔ اور اس طرح گویا میر تقی میر کی یہ پیشگوئی پوری کردی[۱] کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا۔ تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگیگا"۔ یہ کامل استاد یا ان کی طبع سلیم تھی یا بعض مخلص دوست، ورنہ شاعری میں وہ صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن تھے۔ اور کسی کی شاگردی کا بار منت ان کے سر نہیں[۲]۔

شادی اور دہلی میں آمد

خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کی طرف کچھ اشارہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ مگر ۱۲۲۵ھ میں اس کی استواری کی ایک اور تقریب پیدا ہوئی۔ اس سال، ۷ رجب[۳] (مطابق ۹ راگست ۱۸۱۰ء) کو جب غالب کی عمر پورے تیرہ برس ہوئی اُن کی شادی نواب احمد بخش خاں بہادر کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی گیارہ سالہ صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوگئی[۴]۔ اگرچہ ان کا دہلی میں آنا جانا سات برس کی عمر سے تھا۔ مگر شادی کے دو سال بعد انہوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ جیسے وہ

---

[۱] یادگار غالب صفحہ ۹۸

[۲] کلیات نثر فارسی صفحہ ۷

[۳] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۵

[۴] اس کے بعد معروف کے صاحبزادے علی بخش خاں رنجور کی شادی غالب کی بھانجی امانی خانم سے ہوئی۔ رنجور نے کلیات نثر فارسی کے دیباچہ میں جہاں لکھا ہے کہ "درمیانِ این نحیف و آں سخنورِ یکتا (غالب) از دوسو پیوندِ قرابت استوار است" تو انہیں دونوں رشتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک جگہ یوں تعبیر کرتے ہیں ؏۵۱

"۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔"

دوسری جگہ بھی نواب علاؤالدین احمد خاں ہی کو لکھتے ہیں ؏۵۲:-

"اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔"

اس خط پر ۱۸۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔ گویا مرزا غالب اکیاون برس پہلے ۱۸۱۲ء میں آگرہ سے دہلی چلے آئے تھے۔ اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے دوسری جگہ یہ صاف طور پر لکھا ہے کہ ملا عبدالصمد ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۰-۱۱ء) میں وارد اکبر آباد ہوئے اور میں نے انہیں دو برس اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ؏۵۳ اغلب یہی ہے کہ وہ ان سے اپنی تعلیم ختم کرکے دہلی آئے ہوں گے یا ممکن ہے انہیں یہاں پہنچنے کے بعد رخصت کیا ہو۔

۱۸۱۲ء کی تاریخ کی تصدیق ایک اور ذریعہ سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ایک خط

؏۵۱ اردوئے معلی صہ ۲۹۵

؏۵۲ ایضاً صہ ۳۱۸

؏۵۳ درفش کاویانی صہ ۱۳

میں میرا عظم علی مدرس مدرسہ اکبر آباد کو لکھتے ہیں کہ آپ نے لکھا ہے کہ ہماری جدائی کو سولہ سال ہوئے ہیں میرے خیال میں بیس برس سے کم نہیں ہوئے یہ خط سفر کلکتہ سے مراجعت کے بعد لکھا گیا ہے۔ اور وہ کلکتہ سے نومبر ۱۸۲۹ء میں واپس دہلی پہنچ چکے تھے۔ میرے خیال میں یہ خط ۱۸۳۲ء کا لکھا ہوا ہے۔

قیام دہلی کا اثر

دہلی میں اگرچہ وہ اپنا علیحدہ مکان لے کر رہے مگر ظاہر ہے کہ نواب احمد بخش خاں اور نواب الٰہی بخش خاں کی عزیزداری نے جہاں ان کا حلقۂ احباب وسیع کر دیا ہوگا۔ وہاں یہ احباب بھی اونچے طبقہ کے لوگ ہونگے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف اگر ایک طرف کہنہ مشق اور قادر الکلام سخنور تھے۔ تو دوسری طرف صاحب حال و قال فقیر اور صوفی۔ غالب جب بھی ان کے ہاں کسی مجلس میں شریک ہوئے ہونگے تو وہاں ان کے کانوں میں یا شعر و سخن کی باتیں پڑی ہونگی یا مذہب و تصوف کی۔ شعر و شاعری کی چیٹک ان کو پہلے ہی سے تھی یہاں تصوف کا بھی کچھ ذاتی تجربہ ہوا جس کے متعلق کسی نے کہا ہے برائے شعر گفتن خوب است۔ یہ ماحول ان کے ذوقِ شعری کے منافی تو نہ تھا۔ مگر اس میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی۔ کہ شاعری میں جس غلط راہ کو وہ قیام آگرہ کے دوران میں اختیار کر چکے تھے۔ انہیں اس سے ہٹا سکتا۔ مگر قدرت کو منظور نہ تھا کہ یہ گوہر گرانمایہ یوں ضائع ہو۔ غالب کی ملاقات قاضی فضل حق خیر آبادی سے ہوئی۔ اور دونوں کے تعلقات نہایت گہرے اور دوستانہ ہو گئے۔ قاضی صاحب موصوف آخری دور کے فاضلِ اجل اور امامِ معقولات ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے غالب کو ان کی

ع۵ کلیات نثر فارسی صفحہ ۴۹

بے راہ روی پر متنبہ کیا۔ خوش قسمتی سمجھئے کہ غالب کے دل میں ان کی وقعت تھی اور وہ ان کے خلوص اور پایۂ سخن سنجی کو مانتے تھے۔ ورنہ کیا بعید تھا کہ جیسے انھوں نے اس سے پیشتر اکثر لوگوں کی نکتہ چینی پر کیا تھا۔ اُسی طرح ان کی بات کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھتے۔ قاضی فضل حق ہی کی کہنے پر غالب نے اپنے دیوان کا ایک انتخاب کیا جو اب متداول ہے۔

اخلاقی اصلاح

اگر قاضی فضل حق مرحوم اور ان کے رفقا کی صحبت، کا اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ شاعری میں اپنی غلط روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آ جاتے۔ تو یہ کام بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر کام غالب کی اخلاقی اصلاح کا ہوا۔ ان کی اس زمانہ کی اخلاقی پستی کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔ اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہتے۔ تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کچھ معروف کی عزیزداری اور کچھ قاضی صاحب موصوف اور دیگر احباب کی دینداری کا یہ اثر ہوا کہ وہ سنبھل گئے۔ اس زمانہ میں دہلی ایک بہت بڑے مذہبی بحث و مباحثہ کا میدان بنا ہوا تھا۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی وہابیت اور عدم تقلید کے اصول کے علم بردار تھے۔ اور قاضی فضل حق حامیانِ تقلید کے قافلہ سالار۔ تمام دہلی ان دو دھڑوں میں منقسم تھا۔ غالب بھی اس ہنگامہ کی لپیٹ سے نہ بچ سکے۔ قاضی فضل حق ان کے نہایت عزیز دوست تھے۔ اس لئے انہیں مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا اگرچہ حقیقت میں ان کا نقطۂ نظر فریق ثانی کے اصولوں کا مؤید تھا۔ انھوں نے قاضی صاحب موصوف کے کہنے پر ایک فارسی مثنوی بھی "امتناع نظیر خاتم النبیین" کے نظریہ کے متعلق لکھی۔ اول اول اس میں بھی

انہوں نے اپنی فطری سلامت روی کے اقتضا سے وہی کچھ لکھا جو اصولاً صحیح تھا۔ مگر وقتی مصلحتیں دائمی صداقت پر غالب آئیں اور انہیں قاضی صاحب کے کہنے پر اس میں ردو بدل کرنا پڑا۔[عـ۵]

ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ غالب نے اپنی آزادانہ زندگی ترک کردی۔ اگرچہ وہ اب بھی کبھی کبھی "روزِ ابر" اور "شبِ ماہتاب" میں شراب نوشی تو کر لیتے تھے اور آخر تک کرتے رہے۔ مگر زندگی کا وہ خود کشانہ ہنجار یک قلم موقوف ہوگیا۔ ان میں مذہبیت کا عنصر پیدا ہوگیا۔ اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا "اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ" مگر اب جو نئی مہر انہوں نے ۱۲۳۸ھ میں کندہ کرائی۔ اس پر کندہ ہے "محمد اسد اللہ خاں"۔ یہ دونوں مہریں جس عظیم الشان ذہنی انقلاب کی شاہد ہیں اس کی تشریح الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔

مالی پریشانیوں کا آغاز

غالب جب تک آگرہ میں رہے۔ انہیں خرچ کی کوئی تنگی نہیں تھی۔ روپیہ کی افراط تھی۔ اس لئے انہیں "شعر و شاہد و شمع و مے و قمار" کے ذوق کی تسکین کے لئے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب دہلی میں آئے تو یہاں بھی کچھ دن یہی رنگ رہا۔ ساڑھے سات سو پنشن کے نواب احمد بخش خاں سے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ سلوک کرتے رہتے تھے۔ الور سے بھی کچھ نہ کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ والدہ زندہ تھیں وہ بھی گاہے گاہے آگرہ سے بھیجتی رہتی تھیں۔ مگر یہ صورتِ حالات جلد ہی بدل گئی۔

نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۲۵ء میں سرکارِ انگریزی اور الور دربار کی منظوری

عـ۵ یادگارِ غالب صـ۱۷ یہ کلیاتِ نظم فارسی میں کی چھٹی مثنوی ہے۔

اور اپنے خاندان کی رضامندی سے اپنی جایداد کی یوں تقسیم کی، کہ ان کے بعد فیروز پور جھرکہ کی گدی پران کے بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خاں بیٹھیں جو انکی میواتی بیوی مُدی بیگم عرف بہو خانم کے بطن سے تھے۔ اور لوہارو جاگیران کے دونوں چھوٹے صاحبزادوں نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کو ملے۔ جو ان کے اپنے خاندان کی بیوی بیگم جان صاحبہ کی اولاد تھے۔ چونکہ بھائیوں میں آپس میں کشمکش تھی اور خاندان کے دوسرے افراد بھی شمس الدین احمد خاں کو چنداں پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے نواب احمد بخش خاں کو بعد میں خیال آیا کہ ممکن ہے میری موت کے بعد کوئی جھگڑا کھڑا ہو جائے۔ اور شمس الدین احمد خاں معاہدہ کے خلاف اپنے چھوٹے بھائیوں کا حق غصب کر لے۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ اس فیصلہ پران کی زندگی ہی میں عملدرآمد شروع ہو جائے۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں وہ گوشہ نشین ہو گئے۔ شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کے نواب تسلیم کر لئے گئے اور لوہارو دوسرے دونو بیٹوں کو مل گیا۔

اس نئے انتظام کا غالب کے معاملات پر بہت گہرا اثر پڑا۔ آئندہ ان کی پنشن نواب شمس الدین احمد خاں سے متعلق ہو گئی۔ اور چونکہ غالب کے تعلقات نواب کے مخالفین سے تھے۔ اس لئے ان کی پنشن کی ادائیگی میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے جانے لگے۔ پنشن کے علاوہ وقتاً فوقتاً جو فتوحات نواب احمد بخش خاں کی طرف سے ملا کرتی تھیں، وہ یک قلم بند ہو گئیں۔ قرضخواہوں نے یہ مخالف حالات دیکھ کر غالب سے اپنا روپیہ واپس مانگا اور تقاضوں سے ناک میں دم کر دیا۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ غالب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف انہی دنوں تیس برس

کی عمر میں دیوانہ ہو گئے۔ غالبؔ جنہوں نے عسرت اور تکلیف کا ایک دن نہیں دیکھا تھا، مصیبتوں کی اس یکبارگی یلغار سے گھبرا گئے۔

پنشن کا قضیہ

۱۸۲۵ء ہی میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے غالبؔ کو اور زیادہ پریشان کیا۔ اس سال خواجہ حاجی خاںؔ کا انتقال

ع۵ خواجہ حاجی خاں (یا ان کے والد خواجہ قطب الدین خاں) غالبؔ کے دادا کے ساتھ ہی ہندوستان آئے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے بموجب (دیکھو مضمون مذکور) وہ غالبؔ کے جد اعلیٰ ترسم خاں کے چھوٹے بھائی رستم خاں کی اولاد میں سے تھے۔ یعنی تین چار پشت اوپر غالبؔ اور خواجہ حاجی خاں کا سلسلۂ نسب مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ حاجی خاں کی شادی انہی مرزا جیون بیگ کی صاحبزادی امیر النسا بیگم سے ہوئی۔ جن کے ایک صاحبزادے مرزا اکبر بیگ سے غالبؔ کی ہمشیرہ (یعنی میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی بھتیجی) چھوٹی خانم صاحبہ منسوب تھیں۔ خواجہ حاجی خاں چار سو سوار کے اس رسالہ میں ایک افسر تھے (اور ان کے علاوہ دو افسر اور تھے) جو میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ماتحت تھا۔ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر جب یہ رسالہ ٹوٹا اور ان میں سے صرف پچاس سوار نواب احمد بخش خاں کو دئے گئے تو خواجہ حاجی خاں ان پچاس سواروں کے افسر مقرر کئے گئے۔

ظاہر ہے کہ ان دور کی رشتہ داریوں کے خیال سے خواجہ حاجی خاں کسی طرح میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے پس ماندگان میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ کہ وہ پانچ ہزار میں سے دو ہزار کے مستحق قرار پائیں نواب احمد بخش خاں نے جو کیا۔ واللہ اعلم ان کی کیا نیت تھی۔ مگر آج اگر میرزا فرحت اللہ بیگ واقعات کو (باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ ہو)

ہوگیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں۔ جو ۷ر جون ۱۸۰۶ء والے شقہ کی تقسیم کی رُو سے دو ہزار سالانہ کے حصہ دار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا حصہ ان کے دونوں بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جانؔ اور بدرالدین خاں عرف خواجہ امانؔ (مترجم بوستان خیال) کے نام منتقل کر دیا گیا۔ غالبؔ اسی کو نا انصافی خیال کرتے تھے۔ کہ خواجہ حاجی خاں کو دو ہزار سالانہ ملیں۔ اب ان کے مرنے کے بعد جب یہ رقم ان کے صاحبزادوں کو ملنے لگی تو انہوں نے اس پر ناراضی اور شکایت کا اظہار کیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔

غالبؔ کو یقین تھا کہ ۴ر مئی ۱۸۰۶ء والی قرارداد کے بموجب ہم لوگوں کو دس ہزار روپیہ سالانہ ملنا چاہیئے۔ کیونکہ انہیں ۷ر جون والے شقہ کا علم نہ تھا۔ مگر آج تک انہوں نے اس انتظام کے خلاف کوئی عملی احتجاج نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہیں نواب احمد بخش خاں کی بزرگی کا خیال تھا۔ مگر اس سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نواب احمد بخش خاں کی مہربانیاں ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ تک تھوڑی محدود تھیں۔ وہ اس کے علاوہ اکثر خود بھی سلوک کرتے رہتے تھے۔ اور الور وغیرہ سے بھی دلوا دیتے تھے۔ مگر نواب احمد بخش خاں کے گوشہ نشینی اختیار کر لینے اور نواب شمس الدین احمد خاں کے کارفرما ہو جانے سے صورتِ حالات بالکل بدل گئی۔ خواجہ حاجی خاں مرحوم کے حصہ کا جھگڑا تو تھا ہی۔ نواب شمس الدین

(بسلسلۂ حاشیہ صفحہ ۲۸) توڑ مروڑ کر ہمیں یہ یقین دلانا چاہیں کہ خواجہ حاجی خاں غالبؔ کے خاندان کے بزرگ تھے۔ تو ہم کس طرح صاف واقعات سے آنکھیں بند کرکے ان کی مان سکتے ہیں۔

احمد خاں کے نامطبوع سلوک نے ان کے غصہ کی آگ کو اور ہوا دی اور انہوں نے طے کر لیا کہ اس ناانصافی کے برخلاف سرکار انگریزی میں شکایت کرنا چاہیئے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ آخری اقدام سے پہلے میرزا نے ایک بار نواب احمد بخش خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی شکایتوں کے ازالہ کی کوشش کی [۱]۔ ان کے دوستوں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ آپ نے لمبے عرصہ کے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی ایسی حرکت نہ کرنا چاہیئے جس سے کسی طرح نواب احمد بخش خاں کو صدمہ پہنچے۔ مگر انہیں جب اس آخری کوشش میں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی تو اس پر انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اب اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ کلکتہ جاؤں اور وہاں گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے تمام حالات رکھ کر داد خواہ ہوں۔

سفرِ کلکتہ یہ غالب کی زندگی کا سب سے لمبا سفر ہے۔ وہ اگست ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوئے اور رستہ میں گیارہ ماہ کے قریب لکھنؤ میں [۲]

---

[۱] کلیات نثر صفحہ ۴۶ (خط بنام میرزا علی بخش)

[۲] میرزا نے لکھنؤ پہنچ کر معتمد الدولہ آغا میر کے حضور پیش کرنے کیلئے جو نثر فارسی صنعتِ تعطیل میں لکھی تھی۔ اس کے آخر میں اگرچہ سنہ نہیں مگر تاریخ دوم محرم الحرام درج ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نواب احمد بخش خاں کی وفات (ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) کے زمانہ میں مرشد آباد کے قرب و جوار میں تھے۔ (کلیات نثر فارسی صفحہ ۴۷) اور لکھنؤ سے ۲۶ ذی قعدہ کو روانہ ہو کر ۲۹ ذی قعدہ کو کانپور پہنچے۔ تو ماننا پڑتا ہے کہ وہ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ سے کانپور گئے۔ اور اس سے پہلے محرم ۱۲۴۲ھ (اگست ۱۸۲۶ء) میں دہلی سے روانہ ہو کر لکھنؤ پہنچے۔ گویا قیام لکھنؤ کا زمانہ گیارہ ماہ کے قریب ہوا۔

ٹھیر کر ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء (۴ شعبان ۱۲۴۳ھ ؟) کو کلکتہ پہنچے۔ ع۹ یہاں انہوں نے شملہ بازار میں گرو کے تالاب کے نزدیک میرزا علی سوداگر کی حویلی میں قیام کیا۔ ع۱۰ مکان کھلا اور پُر فضا تھا۔ تمام ضروریات کے سامان مہیا تھے۔ گوشۂ صحن میں ایک شیریں پانی کا کنواں بھی تھا۔ اور سب پر مستزاد یہ کہ ان تمام سہولتوں کے باوجود کرایہ صرف دس روپیہ ماہوار تھا۔ ع۱۱

یہاں پہنچ کر انہیں کونسل کی طرف سے جواب ملا کہ یہ مقدمہ پہلے دہلی میں ریذیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ اس کی رپورٹ پر یہاں مناسب کارروائی کی جا سکتی ہے۔ میرزا کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ واپس دہلی آتے اور پھر ہفتخواں طے کر کے کلکتہ پہنچتے۔ انہوں نے خود تو کلکتہ ہی میں قیام کیا اور ایک وکیل کے ذریعہ ریذیڈنسی سے رپورٹ کرائی۔ انہیں پورا یقین تھا کہ انصاف میری طرف ہے۔ اور مقدمہ کا فیصلہ ضرور میرے حق میں ہو جائے گا۔ اسی امید پر وہ ڈیڑھ سال سے زیادہ کلکتہ میں پڑے رہے۔ حکام کے عمدہ رویہ سے انہیں یہ امید بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ضرور ان کے حسب دلخواہ فیصلہ کر دینگے۔ جب وہ دہلی سے روانہ ہوئے تھے، تو اتنے مایوس اور دل شکستہ تھے، کہ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اب ہندوستان میں نہیں رہوں گا۔ بلکہ ایران چلا جاؤں گا اور وہیں یزد کے آتشکدوں اور شیراز کے میخانوں میں زندگی کے باقی دن گزار دوں گا۔ مگر کلکتہ میں افسروں کے حوصلہ افزا

ع۹ کلیات نثر فارسی ص ۸۷ (بنام مولوی محمد علی خاں) یہاں پر تاریخوں اور دنوں میں کچھ تفاوت ہے

ع۱۰ ایضاً ص ۵۷ (خط بنام رای چھجمل)

ع۱۱ ایضاً ص ۸۷ (خط بنام مولوی محمد علی خاں)

برتاؤ سے ان کی ڈھارس بندھی اور انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا[۵۱]۔ بلکہ کلکتہ کی فضا اور ماحول انہیں کچھ اتنا پسند آگیا تھا۔ کہ وہ کہتے ہیں۔ اگر میں متاہل نہ ہوتا اور خانہ داری کی ذمہ داریاں میری راہ میں حایل نہ ہوتیں تو مدت العمر کے لئے کلکتہ ہی میں رہ جاتا۔[۵۲]

چونکہ کلکتہ کا مزید قیام بے سود تھا۔ بلکہ گمان غالب یہ تھا کہ وہ دہلی میں رہ کر زیادہ مفید کام کر سکتے اور یہاں سے اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لاکر بہتر رپورٹ وغیرہ کرا سکتے ہیں اس لئے وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اور تین برس کی غیر حاضری کے بعد ۲۸ر نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس دہلی پہنچے[۵۳]

ادبی معرکہ کلکتہ کے دوران قیام میں ایک دلچسپ ادبی ہنگامہ ہوا۔ وہاں ان دنوں مدرسہ کالکتے کے زیر اہتمام ہر ماہ ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ جب میرزا وہاں پہنچے تو ان کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ ہوا۔ پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ اس میں غالب نے اپنی وہ غزل پڑھی جس کا یہ مقطع بہت مشہور ہے ؎

گرد ہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالب — رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزد

اسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

جزوے از عالمم واز ہمہ عالم بیشم — ہمچو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

---

[۵۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۷۹ (خط بنام میر اعظم علی)

[۵۲] ایضاً صفحہ ۶۸ (خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

[۵۳] میرزا لکھتے ہیں کہ میں یکشنبہ دوم جمادی الثانی (مطابق ۲۸ر نومبر) کو دہلی پہنچا۔ دوم جمادی الثانی کو دوشنبہ تھا۔ اور یکشنبہ کو یکم جمادی الثانی۔ کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۸

اس پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ "ہمہ عالم" کی ترکیب غلط ہے۔ "عالم مفرد ہے اس کا ربط ہمہ کے ساتھ بہ حسب اجتہاد قتیل ممنوع ہے۔"

میرزا غالب بھلا قتیل اور دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ انہوں نے قتیل کا نام سن کر ایک ڈانٹ بتائی کہ قتیل کون ؟ وہ فرید آباد کا کھتری بچہ ؟ میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ غالب کی طرف سے اعتراضات کے جواب نواب اکبر علی خاں اور مولوی محمد محسن صاحب[علہ] اور سعادتِ ہرات کے رئیس کفایت خاں صاحب نے دیئے[عطہ]۔ مگر مخالفت کسی طرح فرد نہ ہوئی۔ چونکہ کلکتہ کے لوگ زیادہ تر قتیل کے شاگرد تھے۔ اس لئے غالب نے یہی سوچا کہ دریا میں رہ کر مگر سے بیر عقلمندی کا شیوہ نہیں۔ ابھی نہیں معلوم مجھے یہاں کتنے دن اور ٹھہرنا ہے اور ان سے کیا کیا کام لینا ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جس مقصد سے وہاں گئے تھے۔ ان ادبی بحثوں میں پڑ کر پوری توجہ اور سکون سے اس کی چارہ جوئی بھی ناممکن تھی۔ ان تمام امور کو مدنظر رکھکر انہوں نے اپنی مشہور مثنوی "باد مخالف" لکھی۔ جس میں اپنے سفر کلکتہ کی غرض و غایت اور فارسی میں اپنے مسلک اور اصول کی توضیح کی۔ اور آخر میں قتیل کی بھی ہجو ملیح سی کر دی۔ جس میں تعریضات کے اتنے تیز نشتر تھے۔ کہ اس سے سکون ہونا تو در کنار۔ ناممکن ہے مخالفت اور نہ بڑھ گئی ہو۔

علہ کلیات نثر فارسی صفحہ ۸۰ (خط بنام مولوی محمد علی خاں)

عطہ عود ہندی صفحہ ۱۷۱ (خط بنام عبدالرزاق شاکر)

پنشن کا مزید بیان

غالب کا دعویٰ یہ تھا کہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کے حکم کے مطابق مجھے اور میرے خاندان کے دوسرے افراد کو دس ہزار سالانہ ملنا چاہیئے۔ نواب لوہارو پانچ ہزار دیتے ہیں اور اس میں سے بھی دو ہزار ایک دوسرے شخص خواجہ حاجی خاں (یا اس کے ورثا) کو ملتے ہیں جن کا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ نواب احمد بخش خاں کا اکتوبر ۱۸۲۷ء میں انتقال ہوگیا۔ اب مقدمہ میرزا اور نواب شمس الدین احمد خاں کے درمیان تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں نے ۷ جون ۱۸۰۶ء والا فارسی شقہ پیش کیا جس کی رو سے یہ پانچ ہزار کی تقسیم ہوئی تھی۔ میرزا کو اس شقہ کا علم بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اس کی صحت سے انکار کردیا۔ اور کہا کہ یہ جعلی ہے یا کم از کم دھوکے اور فریب سے حاصل کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی پشت پر انگریزی حروف میں دستخط نہیں۔ جیساکہ سرکاری دفتر کا ایسے تمام خطوط کے متعلق دستور ہے جو فارسی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ شقہ درخورِ اعتنا نہیں اور عملدرآمد اسی ۴ مئی ۱۸۰۶ء والے حکم پر ہونا چاہیئے۔ جو اس سے پہلے باضابطہ لارڈ لیک کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا۔ چونکہ جس زمانے میں نواب احمد بخش خاں نے یہ شقہ لارڈ لیک سے حاصل کیا تھا۔ ان دنوں سرجان ملکم ان کے سکرٹری تھے۔ اس لئے ۲۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو تمام کوائف مقدمہ کے ساتھ یہ شقہ حکومت بمبئی کے چیف سیکرٹری کے پاس بھیجا گیا۔ کہ وہ سرجان ملکم سے (جو اب گورنر بمبئی تھے) دریافت کرکے لکھیں کہ غالب کا دعویٰ کس حد تک صحیح ہے۔ سرجان ملکم نے کہا کہ واقعی یہ شقہ نواب احمد بخش خاں کو دیا گیا تھا۔ پشت پر انگریزی دستخطوں کی عدم موجودگی کا عذر چنداں قابل پذیرائی نہیں۔ اس پر

۲۷ر جنوری ۱۸۳۱ء کو میرزا کے نام حکم لکھا گیا کہ گورنر جنرل با جلاس کونسل موجودہ انتظام میں ردوبدل کرنے پر تیار نہیں۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی اپنے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی یہی مطالبہ کرتے رہے کہ ہمیں اصل معاہدہ کے مطابق دس ہزار سالانہ ملنا چاہیئے۔

ولیم فریزر کا قتل غالب کی پنشن کا قضیہ ابھی درمیان ہی میں تھا۔ کہ خود نواب شمس الدین احمد خاں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ ۲۲ر مارچ ۱۸۳۵ء کو شام کے سات بجے کسی شخص نے دہلی کے ریزیڈنٹ مسٹر ولیم فریزر کو گولی سے ہلاک کر دیا۔ فوراً تمام ناکے بند کر لیے گئے اور تفتیش ہونے لگی۔ آخر پولیس نے نواب شمس الدین احمد خاں کے داروغہ شکار کریم خاں کو گرفتار کر لیا۔ تھوڑے دن بعد نواب کا ایک اور ملازم واصل خاں بھی گرفتار ہوا۔ جب مزید تحقیقات ہوئی اور کریم خاں کا بیان لیا گیا۔ تو عجیب و غریب انکشافات ہوئے اور بعض قراین ایسے پائے گئے۔ جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ خود نواب کا دامن بھی اس قتل کی ذمہ داری سے پاک نہیں۔ آخر مجسٹریٹ دہلی نے نواب کو لکھا کہ آپ فیروزپور سے یہاں آئیں۔ نواب شمس الدین احمد خاں ۸ر اپریل ۱۸۳۵ء کو دہلی پہنچے۔ یہاں جب مسٹر سائمن فریزر مجسٹریٹ نے اُن سے بعض سوالات پوچھے تو نواب کے جوابات سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نواب کو باہر کے لوگوں سے علیحدہ رکھا جائے۔ اور دورانِ تحقیقات میں کوئی شخص ان سے ملاقات نہ کر سکے۔ نواب کی اپنی خواہش تھی کہ مجھے دریا گنج میں اپنے مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ مگر آخر یہی فیصلہ ہوا کہ وہ پولیس کے پہرہ میں کشمیری دروازہ کے باہر انگریزی افسروں

کے کوارٹروں میں رہیں۔ صرف پانچ ملازم اُن کی خدمت اور غور و پرداخت کے لئے رکھنے کی اجازت دی گئی۔ نہ باہر سے کوئی شخص اندر جا سکتا تھا اور نہ اندر سے کوئی باہر آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نواب کے تمام متعلقین خصوصاً ان کے خسر میرزا مغل بیگ پر بہت سختی روا رکھی گئی۔ ان کی خانہ تلاشی ہوئی اور کچھ دن انہیں نظر بند بھی رہنا پڑا۔

جایداد لوہارو کا قضیہ دراصل نواب شمس الدین احمد خاں اور مسٹر ولیم فریزر کے درمیان بنائے مخاصمت پہلے سے موجود تھی۔ اور اسی چیز نے ان کے خلاف شبہات کو تقویت دی۔ فیروز پور جھرکہ کا علاقہ نواب شمس الدین احمد خاں کو ملا تھا اور لوہارو ان کے چھوٹے بھائیوں نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کے حصہ میں آیا تھا۔ نواب احمد بخش خاں کی وفات کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں نے اس تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی۔ جب صدر سے رپورٹ طلب کی گئی تو ولیم فریزر نے ریذیڈنٹ کی حیثیت میں ان کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ نواب شمس الدین احمد خاں اس مخالفانہ رپورٹ کی بنا پر ولیم فریزر سے سخت ناراض تھے۔

غالب اور فتح اللہ بیگ خاں نواب شمس الدین احمد خاں کہتے تھے کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ دراصل یہ سب کچھ میرے خلاف میرے دشمنوں کی جھوٹی شہادتوں اور رپورٹوں کی بنا پر کیا جا رہا ہے جن کا سرغنہ مرزا فتح اللہ بیگ خاں ہے۔ چونکہ ولیم فریزر ریذیڈنٹ غالب کے بہت گہرے دوست اور مربی تھے۔ اور مجسٹریٹ شہر بھی ان کے ملنے والوں میں سے تھے۔ اس لیے لوگوں کو شبہ ہوا کہ مرزا فتح اللہ بیگ خاں کے علاوہ

غالب نے بھی نواب کے خلاف جاسوسی کی ہے[عل۵]۔ لیکن میرا خیال ہے کہ غالب کا دامن اس دھبہ سے پاک ہے۔

فروری ۱۸۳۵ء میں غالب کے خلاف ایک دیوانی مقدمہ میں ڈگری ہو چکی تھی۔ ان دنوں دستور یہ تھا کہ اگر مقروض کوئی صاحبِ حیثیت اور با وجاہت شخص ہو تو عدم ادائیگیِ زرِ ڈگری کی صورت میں اسے صرف اسی حالت میں گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ جب وہ اپنے مکان سے باہر ہو۔ بھلا غالب کے پاس روپیہ کہاں کہ وہ ادا کر دیتے۔ گرفتاری کی ذلت سے بچنے کے لئے وہ اپنا سارا وقت گھر ہی میں گذارتے تھے۔ مغرب کے بعد سوار ہو کر نکلتے اور دوستوں سے ملتے۔ انہی دنوں میں یہ قتل ہو گیا۔ مجسٹریٹ شہر ان کے دوست تھے۔ وہ جیسے دوسرے دوستوں کے پاس آتے جاتے۔ ویسے ہی ان کے مکان پر بھی جاتے۔ اور تھوڑی دیر گپ کر کے بعد واپس چلے آتے۔ وہاں ولیم فریزر کے قتل کے متعلق بھی گفتگو ہوئی۔ اور جیسا کہ خود میرزا غالب نے لکھا ہے[۵۲] مجسٹریٹ نے انہیں "پژوہشِ کار و حلِ اسرار" میں اپنا ہم راز بنا لیا تھا۔ مگر اس سے زیادہ انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ واللہ اعلم

نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی
طویل تحقیقات اور مقدمہ کے بعد کریم خاں اصل قاتل قرار پایا

عل۵ مرزا فتح اللہ بیگ خاں کو غالب نے نواب شمس الدین احمد خاں کا ابنِ عم لکھا ہے (کلیات نثر صفحہ ۷۶) دراصل مرزا فتح اللہ بیگ خاں بیٹے تھے نواب محمد بخش خاں کے۔ اور نواب محمد بخش خاں کے والد تھے قاسم جان۔ جو نواب احمد بخش خاں کے والد عارف جان کے بھائی تھے۔

عل۵۲ کلیات نثر فارسی صفحہ ۷۶ (خط بنام شیخ امام بخش ناسخ)

اور اسے اس جرم کی پاداش میں ۲۶ راگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجسٹریٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ قتل نواب شمس الدین احمد خاں کی انگیخت پر ہوا ہے۔ اس لئے وہ بھی اسی سزا کے مستحق ہیں چونکہ نواب ایک ریاست کے حکمران تھے۔ اس لئے مجسٹریٹ کو انہیں سزا دینے کا اختیار نہیں تھا۔ اس نے مقدمہ کے تمام کوائف۔ اپنا فیصلہ اور سزا کی تجویز کی مکمل رپورٹ گورنر جنرل کو کلکتہ بھیج دی۔ جب نواب کو ان تمام حالات کی اطلاع ملی۔ تو انہوں نے اپنے وکیل اسفندیار بیگ خاں کو کلکتہ بھیجا۔ کہ وہ گورنر جنرل کی خدمت میں ذاتی طور پر حاضر ہو کر عذرداری پیش کرے۔ وکیل مذکور نے کلکتہ کے ایک انگریز سالسٹر مسٹر چارلس تھیکرے کی وساطت سے درخواست دی۔ مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ۲۱ ر ستمبر ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل نے باجلاس کونسل یہ فیصلہ کیا۔ کہ نواب شمس الدین احمد خاں کو مسٹر ولیم فریزر کے قتل کی انگیخت کے جرم میں پھانسی کی سزا دی جائے۔ اور ان کی جایداد اور فیروزپور جھرکہ کی ریاست بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں ۸ ر اکتوبر ۱۸۳۵ء کو صبح کے وقت نواب کو کشمیری دروازہ کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ چونکہ خطرہ تھا کہ کہیں فساد یا بلوہ نہ ہو جائے اس لئے موقعہ پر دیسی اور گورہ فوج کا کافی انتظام تھا۔ ایک گھنٹہ تک لاش لٹکتی رہی اور اس کے بعد نواب کے خسر میرزا مغل بیگ خاں کے حوالے کر دی گئی۔ جنہوں نے اسے قدم شریف میں دفن کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مقدمۂ پنشن کا فیصلہ

نواب شمس الدین احمد خاں کی وفات اور فیروزپور جھرکہ کی ریاست کی ضبطی کے بعد میرزا غالب کی

پنشن دہلی کلکٹری[۵۱] سے ملنے لگی۔ ان کا مقدمہ بدستور چل رہا تھا۔ آخر ۱۸ جون ۱۸۳۶ء کو لفٹننٹ گورنر غرب وشمال (حال یو۔پی) نے فیصلہ کیا۔ کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کے شقہ کے مطابق جو ساڑھے سات سو سالانہ انہیں ملتے رہے ہیں وہی درست ہیں۔ اور اس سے زیادہ کے وہ حقدار نہیں۔ میرزا نے اس کے خلاف گورنر جنرل کے پاس اپیل کیا، مگر وہاں سے بھی یہی فیصلہ بحال رہا۔

سب طرف سے مایوس ہو کر میرزا نے ۱۴ نومبر ۱۸۳۶ء کو یہ درخواست دی کہ میرا مقدمہ یا تو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے سامنے رکھا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کورٹ آف ڈائرکٹرز کے فیصلہ کے لئے ولایت بھیج دیا جائے۔ اس پر ۵ دسمبر ۱۸۳۶ء کو جواب ملا۔ کہ تمہارے مقدمہ کے تمام کاغذات ولایت بھیج دئے جائینگے[۵۲]۔ اس اطلاع کے موصول ہونے پر میرزا نے ۲۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو درخواست دی کہ مئی ۱۸۰۶ء سے آج تک جو مجھے دس ہزار سے کم ملا ہے۔ وہ دو لاکھ تین ہزار روپیہ بنتا ہے۔ یہ اس دو لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم سے وضع کر کے مجھے دیا جائے۔ جو نواب شمس الدین احمد خان نے اپنی وفات سے پہلے خزانۂ سرکار میں جمع کرائی تھی۔ دوم ہمیں تین ہزار سالانہ پنشن کا اپریل ۱۸۳۵ء تک کا بقایا اس جائداد سے ملے جو نواب فیروز پور جھرکہ چھوڑ مرے ہیں اور سوم جب تک کورٹ آف ڈائرکٹرز کا فیصلہ موصول نہیں ہوتا۔ ہمیں تین ہزار سالانہ باقاعدہ ملتا رہے۔ مگر ان تمام درخواستوں

---

۵۱ مکاتیب غالب ص ۱۱

۵۲ یہ تمام کاغذات (La Belle Alliance) نامی جہاز کی ڈاک میں ۱۰ مئی ۱۸۳۷ء کو ولایت بھیجے گئے تھے۔

کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور ۱۸۴۲ء کے شروع میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی غالب کے خلاف فیصلہ دیدیا اور کہا کہ جو کچھ ہندوستان میں فیصلہ ہو چکا ہے وہی بحال رہیگا۔ میرزا اس کے بعد بھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے ۲۹ر جولائی ۱۸۴۲ء کو اس فیصلہ کے خلاف بطور اپیل ایک میموریل حضور ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی خدمت میں ارسال کرنے کے لئے گورنر جنرل کو بھیجا۔ مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور آخر وہ ۱۸۴۴ء میں مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔

حادثۂ اسیری

جون ۱۸۴۷ء میں میرزا کو ایک سخت حادثہ پیش آیا۔ انہیں بچپن سے چوسر اور شطرنج وغیرہ کھیلنے کی عادت تھی۔ اس زمانہ میں بھی وہ اپنا خالی وقت چوسر کھیلنے میں گذارتے تھے۔ اور محض شغل کے طور پر کچھ بازی بدکر کھیلتے تھے۔ چونکہ حکام ان دنوں قمار بازی کے انسداد کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کر رہے تھے۔ کوتوال شہر نے جو غالب کا دشمن تھا انہیں بھی قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور مجسٹریٹ نے ان کیلئے چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم دیا۔ اور فیصلہ میں لکھا کہ بصورتِ عدمِ ادائیگی جرمانہ چھ ماہ مزید قید اور اگر اصل جرمانہ کے علاوہ پچاس روپیہ ادا کر دیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ لیکن وہ پورے چھ ماہ قید خانہ میں نہیں رہے۔ تین ماہ کے بعد اسی مجسٹریٹ کی سفارش پر وہ رہا کر دئے گئے۔ مگر غالب ایسے حساس آدمی کے لئے یہ حادثہ بہت سخت تھا۔ چنانچہ ان ایام میں جو ترکیب بند انہوں نے لکھا ہے۔ اسکے ایک ایک لفظ سے ان کے غم و غصہ کا اظہار ہوتا ہے[ع۵]۔ زمانۂ اسیری میں ان کے تمام

ع۵ اس واقعہ کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ یادگار غالب (حالی) صفحہ ۲۷، دلی کا آخری سانس (خواجہ حسن نظامی) صفحہ ۱۶ اور غالب (مولانا مہر) صفحہ ۱۲۴ تا صفحہ ۱۲۸۔ غالب کا مذکورہ ترکیب بند بسبد چین میں شامل ہے۔

دوستوں نے ان سے بہت ہمدردی اور خلوص کا اظہار کیا خصوصاً نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد و پلول نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ میرزا نے اس ترکیب بند میں اس کا پرجوش اعتراف کیا ہے۔

قلعہ کی ملازمت

غالب کے لئے یہ بڑی سختی کے دن تھے۔ خاندانی پنشن صرف ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہوار تھی۔ نانہیال سے فتوح کا سلسلہ غالباً بند ہو چکا تھا۔ اور کوئی آمدنی کی صورت نہ تھی۔ وہ شروع سے آرام کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ عسیر الحالی ان پر کتنی شاق گذرتی ہوگی۔ ان کے دوستوں کو بھی فکر ہوئی۔ آخر یہ تجویز ٹھیری کہ کسی طرح میرزا کا تعلق قلعہ معلیٰ سے ہو جائے۔ میرزا کے کلام سے شہادت ملتی ہے کہ ان کے دربار سے بے ضابطہ اور غیر مستقل رنگ کے تعلقات بہت زمانہ سے تھے۔ مگر یہ تعلق بس اتنا ہی تھا کہ وہ عید۔ بقرعید یا کسی شادی وغیرہ کی تقریب پر قصیدہ یا قطعہ پیش کر دیتے۔ وہ مستقل طور پر ملازمان شاہی میں داخل نہیں ہوئے۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ وہ خود ہی اس پر تیار نہیں تھے۔ ذوق ۱۸۰۸ء سے استاد ظفر تھے۔ ان کی موجودگی میں کوئی اور استادِ شاہ اور ملک الشعراء تو ہو نہیں سکتا تھا۔ غالب اس سے کم پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دربار ہی کونسا سنجر اور ملک شاہ یا جہانگیر اور شاہجہاں کا دربار تھا کہ انہیں اس سے کوئی زیادہ توقعات ہوتیں۔ جس زمانہ میں ظفر ابھی ولی عہد تھے۔ ذوق کو چار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی رہی۔ جب تخت پر بیٹھے تو تیس روپے ماہوار ہو گئی[۵۶]۔ مگر احتیاج تو شیریں تک کو روباہ مزاج بنا دیتی ہے۔ جب سب طرف سے مایوس

---

۵۶ آب حیات (محمد حسین آزاد) صفحہ ۴۵۷۔

ہوگئے تو انہوں نے پادشاہ کی وظیفہ خواری اور دعاگوئی پر آمادگی کا اظہار کیا۔ مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا نصیر الدین عرف کالے میاں، بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے۔ اور غالب کے خاص دوست اور مہربان۔ ان کے علاوہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام طبیب شاہی بھی میرزا کے قدردان تھے۔ ان حضرات نے سفارش کی اور بہادر شاہ نے منظور کر لیا کہ میرزا خاندان تیمور کی تاریخ فارسی زبان میں لکھیں۔ میرزا ۴ جولائی ۱۸۵۰ء (مطابق ۲۲ شعبان ۱۲۶۶ھ) کو پادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے[۵۱] ظفر نے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کہہ کر خطاب کیا۔ کارپردازوں نے خلعت پہنایا۔ پچاس روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ اور یوں میرزا باقاعدہ قلعہ کے ملازم ہوگئے۔ حکم ہوا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کتب تواریخ سے حالات جمع کر کے میرزا کو دیں۔ اور میرزا انہیں فارسی زبان کا جامہ پہنا دیں[۵۲]

پرتوستان میرزا کا ارادہ تھا کہ اس تاریخ کو دو حصوں میں لکھیں۔ پوری کتاب کا نام پرتوستان رکھا۔ پہلے حصہ میں آغاز روزگار سے شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کی جہانگردی اور جہانگیری تک کے حالات لکھے۔ اور اس کا نام مہر نیمروز رکھا۔ ارادہ تھا کہ دوسرے حصہ میں ہمایوں سے لے کر بہادر شاہ تک کے حالات تفصیل سے لکھیں۔ اس کا نام بھی ماہ نیم ماہ تجویز کر لیا تھا۔ مگر کتاب کا صرف اسم ہے۔ مسمیٰ عالم وجود میں آیا ہی نہیں[۵۳]

---

[۵۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۳۲۔ یہاں میرزا غلطی سے ۴ جولائی کی جگہ ۴ جون لکھ گئے ہیں۔ ۲۲ شعبان کو ۴ جولائی تھی۔ اور ۴ جون کو ۲۲ رجب۔

[۵۲] ایضاً صفحہ ۱۳۲ ۔۔ [۵۳] ایضاً صفحہ ۱۳۳، اردوی معلیٰ صفحہ ۱۰۶

ظفر کی استادی جیساکہ میرزا نے خود لکھا ہے۔ ۱۸۵۴ء میں ولی عہد فتح الملک مرزا غلام فخرالدین رمز تخلص عرف مرزا فخرو ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کی سرکار سے چار سو روپیہ سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اسی سال ۱۶ر نومبر کو ذوق نے وفات پائی۔ اور بادشاہ نے بھی میرزا سے اصلاح لینا شروع کی۔ اگرچہ بقول مولانا حالی "میرزا غالب اس کام کو بادل ناخواستہ کرتے تھے"؎۱ ان کے علاوہ ظفر کے سب سے چھوٹے شہزادے میرزا خضر سلطان؎۲ نے بھی ان کی شاگردی اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد میرزا اطمینان کا سانس لینے کے قابل ہو گئے ہونگے مگر یہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے۔ دو برس بعد ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو میرزا فخرو نے ہیضہ سے انتقال کیا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ میرزا خضر سلطان ستمبر ۱۸۵۷ء میں مقبرہ ہمایوں میں گرفتار ہوئے اور دہلی کے باہر میجر ہڈسن کی گولی کا نشانہ بنے۔ ظفر پر مقدمہ چلا اور ۵ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں رنگون بھیج دئے گئے۔ جہاں ۱۲ر نومبر ۱۸۶۲ء کو ان کی وفات ہوئی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

غدر زمانۂ غدر کے حالات میرزا نے اپنی تصنیف دستنبو میں تفصیل سے لکھے ہیں وہ خود کہتے ہیں کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو باغی فوج شہر میں داخل ہوئی۔ اور اس دن سے میں نے مکان کا دروازہ بند کر کے باہر کی آمد و رفت ختم کر دی لیکن

؎۱ یادگار غالب (حالی) ص ۳۲

؎۲ یہ وہی میرزا خضر سلطان ہیں جن کے متعلق میرزا کا شعر ہے ؎

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز ۔۔۔ شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

یہ انہوں نے مبالغہ کیا ہے۔ وہ خود ایک خط میں نواب یوسف علی خاں فردوس مکان والی رامپور کو لکھتے ہیں[۵۱]

"دریں ہنگامہ (غدر) خود را بکنار کشیدم و بدیں اندیشہ کہ مبادا اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم خانہ من بتاراج رود و جان درمعرض تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔

اس کے علاوہ بعض اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعے میں بھی جایا کرتے تھے۔ کیونکہ باغیوں نے بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہِ ہندوستان مشہور کر دیا تھا۔ اور میرزا نہیں جانتے تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس لئے انہوں نے یک قلم تعلقات منقطع کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔

ذاتی حالات میرزا ایک ایسے محلہ میں رہتے تھے۔ جس میں حکیموں کے مشہور شریف خانی خاندان کے لوگ رہتے تھے اور چونکہ انہیں مہاراجہ پٹیالہ سے ملازمت کا تعلق تھا۔ اس لئے مہاراجہ نے انگریزوں سے کہہ کر اس محلہ پر پہرہ بٹھا دیا تھا کہ کوئی اس محلہ کے لوگوں سے متعرض نہ ہو۔ اس کے باوجود ان کو کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور لوٹ اور انہیں اتنی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ انگریزوں کے دہلی فتح کر لینے کے بعد ہی باہر جا کر پینے کا پانی لا سکیں۔ خوش قسمتی سے ایک دن ابرِ رحمت برسا اور ان لوگوں نے چادریں باندھ کر گھر بھر کے برتن بھر لئے[۵۲]

ان کی بیگم نے اپنے تمام زیور اور قیمتی کپڑے کالے میاں کے مکان پر بھیج دئے

---

[۵۱] مکاتیبِ غالب صفحہ ۱۳

[۵۲] کلیاتِ نثر فارسی صفحہ ۱۹۴

تھے۔ ان کا خیال ہوگا۔ کہ وہاں زیادہ محفوظ رہیں گے کیونکہ ان کے ساتھ ایک مذہبی تقدس وابستہ تھا اور گمان تھا کہ باغی اور دوسرے ان کا احترام کرینگے اور ان کا گھر نہیں لوٹیں گے۔ مگر کالے میاں کا مکان بھی وقفِ تاراج ہوا۔ اور اُن کے اپنے سامان کے ساتھ میرزا کی بیگم کا سامان بھی لٹ گیا عله

یہ ایام میرزا پر نہایت مصیبت کے گذرے۔ آمدنی بالکل مفقود اور خرچ بدستور۔ شکر ہے کہ ان کے ہندو دوستوں نے ان ایام میں ان کی خبر گیری کی۔ ہمیش داس انہیں شراب مہیا کرتے رہے۔ ہرگوپال تفتہ میرٹھ سے روپیہ بھیجا کئے۔ ان کے علاوہ منشی ہیرا سنگھ۔ سیواجی رام اور اس کے لڑکے بال مکند نے بھی حتی الوسع ان کی خدمت کی عله۔ بدقسمتی سے انہی دنوں میں میرزا کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف نے انتقال کیا۔ میرزا یوسف اسی محلہ میں چند مکان چھوڑ کر رہتے تھے۔ غالب نے چاہا تھا کہ وہ بھی اس ہنگامہ میں ان کے پاس آرہیں۔ مگر انھوں نے غالبًا نہیں مانا۔ انکے ساتھ ایک بوڑھی ماما اور ایک بوڑھا ملازم تھے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ گورے میرزا یوسف کے مکانات میں گھس آئے تھے۔ پھر ایک دن بوڑھا ملازم آیا اور کہا رات میرزا یوسف نے انتقال کیا۔ یہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء (مطابق ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ) کا ذکر ہے۔ غالب نے بھائی کے مرنے کی تاریخ لکھی۔

زسالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف	کہ زیستنے بہ جہاں ورنہ خویش بیگانہ
یکے ورانجمن ازمن ہمی پژوہش کرد	کشیدم آہے وگفتم دریغ دیوانہ
	۱۲۷۴ھ

عله کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۴

عله ایضًا صفحہ ۲۰۵

رام پور سے تعلق غدر کے ساتھ ہی میرزا کی آمدنی کے سب ذرائع بند ہو گئے۔ قلعہ کی تنخواہ تو بند ہونا ہی تھی کیونکہ وہاں تو باغیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ ایک غریب شاعر اور تاریخ نویس کس شمار قطار میں تھا۔ وہ تو اسی کی خیر منائیں کہ باغیوں نے ان سے تعرض نہیں کیا۔ ورنہ کہیں یہ کہہ کر کہ یہ بھی انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ باغی انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے تو وہاں کون تھا جو ان ظالموں کا ہاتھ روک سکتا۔ انگریزوں کی طرف سے جو خاندانی پنشن ملتی تھی۔ وہ بھی بند ہو گئی۔ کیونکہ جب باغیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو انگریزی دفتر ہی کہاں تھا۔ جہاں سے انہیں پنشن ملتی۔ یہ دیکھ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نے میرزا کی بیوی جناب امراؤ بیگم کے پچاس روپے ماہوار مقرر کر دئے۔ دراصل بالواسطہ یہ بھی میرزا کی امداد تھی۔ یہ وظیفہ بیگم کو ان کی حیات تک ملتا رہا۔ چنانچہ میرزا رام پور سے ۲ نومبر ۱۸۶۵ء کو حکیم ظہیر الدین کے خط میں لکھتے ہیں :-

> "سنو میاں ظہیر الدین، تم اپنی دادی (بیگم غالب) کے پاس چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں (خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر) نے اکتوبر کے مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دئے کہ نہیں۔"

یہاں اسی تنخواہ کی طرف اشارہ ہے۔

خوش قسمتی سے غدر سے تھوڑے دن پہلے ان کا دربار رامپور سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ تعلق بہت پرانا تھا۔ یعنی جب بچپن میں نواب یوسف علی خاں

ع۵ اردوئے معلیٰ صد ۱۷۴

فردوس مکان طلبِ علم کی خاطر دہلی تشریف لائے ہیں۔ تو انہوں نے مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ سے عربی اور میرزا غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ مگر اس کے بعد یہ تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ جب نواب فردوس مکان ۱۸۵۵ء میں تخت نشین ہوئے تو میرزا نے قطعۂ تاریخ جلوس کے ذریعہ ان تعلقات کی تجدید چاہی[۵۱] مگر یہ سعی مشکور نہیں ہوئی۔ مولانا فضل حق مرحوم جس زمانہ میں رام پور میں تھے۔ انہوں نے میرزا کو پھر آمادہ کیا کہ وہ ایک قصیدہ مدحیہ نواب فردوس مکان کی خدمت میں بھیجیں۔ اس خط کے بعد میرزا نے ایک عریضہ لکھا اور ایک قصیدہ بھی بھیجا۔ اس خط کے جواب میں نواب فردوس مکان نے ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو ایک خط میں چند اشعار بغرض اصلاح میرزا کے پاس بھیجے[۵۲] اور یوں باقاعدہ وہ دربار رام پور سے وابستہ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنے اس کلام میں تخلص یوسف استعمال کیا تھا۔ اس پر ۱۵ فروری کو میرزا نے ان کی خدمت میں لکھا:[۵۳]

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیسان، ان میں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیں۔ مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک"

اس پر نواب صاحب نے لکھا کہ ہم نے ناظم تخلص اپنے لئے پسند کیا۔

---

۵۱ مکاتیب غالب صفحہ ۳

۵۲ ایضاً صفحہ ۴ (حاشیہ)

۵۳ ایضاً صفحہ ۵

یہ جدید تعلق پیدا ہوئے تین ماہ سے کچھ اوپر ہوئے تھے کہ غدر کا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ ابھی تک رام پور سے باقاعدہ تنخواہ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ نواب ان کو اکثر روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ پہلے خط ہی میں انہوں نے ڈھائی سو روپے بھیجے تھے۔ اور اس کے بعد بھی مسلسل امداد فرماتے رہے۔

غالب کا خیال تھا۔ کہ غدر کے بعد جب امن وامان قائم ہو جائے گا تو میری پنشن بھی حسبِ سابق جاری ہو جائے گی۔ مگر خلافِ امید اس میں کچھ ایسے پیچ پڑے کہ مئی ۱۸۶۰ء تک انہیں پنشن نہ ملی۔ پہلے تو گھر کے برتن کپڑے بیچ بیچ کر انہوں نے دن کاٹے۔ مگر تا بکے ایک دفعہ تو تنگ آ کر گھر سے نکل جانے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ خیال تھا کہ بیوی بچوں کو لوہارو بھیج دیں۔ اور خود کسی طرف کو نکل جائیں۔ بیگم بھی آمادہ ہو گئی تھیں۔ وہ نواب علاؤ الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:[ع۵]

"اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدہ ماجدہ سے اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل ہو نہیں سکتا انہوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کے قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا چل دیا۔ ع

تا در بیابانہ خواستہ گرد گار چیست "

ع۵ اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۱۴

مگر بعد میں کسی وجہ سے انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں میرزا نے نواب یوسف علی خاں بہادر کو لکھا کہ میرا کچھ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اس پر نواب صاحب نے ۱۶ر جولائی ۱۸۵۹ء کو لکھا کہ آئندہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ آپ کو پہنچتی رہے گی علہ یہ تنخواہ انہیں ان کی وفات (فروری ۱۸۶۹ء) تک ملتی رہی۔

پنشن کی بندش غدر ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہوا۔ اور باغی دہلی پر قابض ہو گئے انہوں نے جو تباہی مچائی۔ اس کا کچھ حال میرزا نے دستنبو میں لکھا ہے۔ یعنی انہوں نے انگریزوں کو قتل اور انکے اموال کی لوٹ ہی پر بس نہیں کی بلکہ دیسی امراء اور ان کی املاک پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ ۸ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہو گیا جسکا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ گرفتاریوں اور سزاؤں کا نئے سرے سے بازار گرم ہو۔ جس کے متعلق معمولی سا شبہ بھی ہوا کہ شخص باغیوں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اسے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔

غالب نے غدر کے زمانہ میں انگریزوں کی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی جو کسی نئے انعام کے مستحق ٹھہرتے لیکن ان کے خیال میں ان سے کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ جو دستور قدیم کو برہم کرنے والی ہو علہ اس وجہ سے انہیں یقین تھا۔ کہ جونہی امن قائم ہوگا۔ میری پنشن اور دربار وغیرہ بحال کر دئے جائیں گے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ قیام امن کے بعد جب انہوں نے سلسلہ جنبانی کی تو جواب ملا کہ "ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو"

علہ مکاتیب غالب صہ ۷ (دیباچہ)

علہ ایضاً صہ ۲۲

سکہ کا الزام غالب پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ جب باغیوں نے بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کیا تو تم نے اُن کیلئے سکہ کہہ دیا تھا۔ میرزا کے اردو خطوں میں کئی مقامات پر اس کا ذکر ہے۔ جہاں انہوں نے دوستوں سے پرانے اخبارات طلب کئے ہیں۔ دراصل یہ قصہ یوں ہے کہ غدر کے ایام میں ایک پرچہ نویس نے یہ اطلاع دی کہ ۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء کو جب بہادر شاہ نے دربار کیا تو میرزا غالب نے یہ سکہ کہہ کر ایک پرچہ پر لکھا اور حضور میں گزرانا ؎

بزر زد سکہ کشور ستانی — سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

غالب کا جواب یہ تھا کہ نہ صرف یہ بلکہ ایک اور سکہ بھی[ع۱] شیخ ابراہیم ذوق نے اس وقت کہا تھا۔ جب بہادر شاہ ۳۰ر ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت پر بیٹھے ہیں۔ اسی لئے وہ دوستوں سے ۱۸۳۷ء کے اخبار اور خصوصاً مولوی محمد باقر (والد مولانا محمد حسین آزاد) کا اخبار مسمّی بہ دہلی اخبار مانگتے تھے۔ کیونکہ ذوق اور مولوی محمد باقر میں گہرا یارانہ تھا اور یہ سکے ان کے اخبار میں شائع ہوئے تھے[ع۲] مگر نہ یہ اخبار ملا اور نہ وہ اس الزام سے اپنا دامن پاک ثابت کر سکے۔

رام پور کا سفر نواب یوسف علی خاں بہادر نے از راہِ استاد نوازی میرزا کو رام پور آنے کے لئے تین بار دعوت دی تھی۔ پہلی بار ۲۵ر نومبر

ع۱ دوسرا سکہ غالباً یہ تھا ؎

بسیم و زر زدہ شد سکہ بفضلِ الٰہ — سراج دین ابوظفر شہ بہادر شاہ

ع۲ اردوئے معلیٰ صفحہ ۹۹

۱۸۵۸ء کو۔ میرزا نے اس کا جواب ۳ ر دسمبر کو دیا[1]۔

"میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے۔ میں وہاں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا جاؤں۔ سنا جاتا ہے اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغاز سال ۱۸۵۹ سنہ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اُس کو روپیہ اور جس کو جواب ملنا ہے اُس کو جواب مل جائے۔"

مگر جنوری ۱۸۵۹ء آیا اور گذر بھی گیا اور پنشن کا فیصلہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اس پر نواب فردوس مکان نے ۱۳ راپریل ۱۸۵۹ء کو تجدید دعوت کی، اس کے جواب میں غالب نے ۱۸ راپریل کو لکھا[2]

"پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموع پنشنداروں کی مثل مرتب ہے۔ اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتہ سے میری پنشن کے کاغذ طلب کئے اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتہ کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا۔ کل میں نے آپ سے سواری اور باربرداری مانگی۔ آج سواری اور باربرداری پہنچی اور کل میں نے رام پور

---

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۱۷۔ نواب فردوس مکان کی دعوت کا خط صفحہ ۱۶ کے حاشیہ میں درج ہے۔
[2] ایضاً صفحہ ۱۹

کی راہ لی۔"

۱۸۵۹ء کا سارا سال گذر گیا۔ اور میرزا کو روپیہ نہ ملا۔ مگر امید ابھی قائم تھی۔ جنوری ۱۸۶۰ء کے شروع میں گورنر جنرل لارڈ کیننگ میرٹھ میں دربار کر کے دہلی پہنچے۔ جب یہ قیام گاہ پر گئے۔ تو وہاں سے جواب ملا کہ ہم ملاقات نہیں کرنا چاہتے۔[علہ] اس سے میرزا بالکل مایوس ہو گئے۔ اور انہوں نے رام پور جانے کی تیاری کر لی۔ نواب صاحب بھی تیسری بار انہیں وسط دسمبر ۱۸۵۹ء میں رام پور آنے کے لئے لکھ چکے تھے[عہ]۔ جب حکومت کی طرف سے انہیں یہ آخری جواب ملا تو وہ ۱۹ر جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے روانہ ہو کر ۲۷ر جنوری کو رام پور پہنچ گئے۔

قیامِ رام پور۔ میرزا نواب زین العابدین خاں عارف مرحوم کے دونوں صاحبزادے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ نواب صاحب نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ میرزا اور لڑکوں سے بھی نذر دلوائی[عہ] پہلے تو نواب صاحب کی خاص کوٹھی قیام کے لئے ملی۔ مگر بعد میں انہی کے کہنے پر محلہ راج دوارہ میں ایک وسیع مکان دے دیا گیا۔[عہ] شروع میں کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا رہا[عہ]۔ لیکن بعد میں سو روپیہ ماہوار دعوت کا مقرر ہو گیا[عہ]۔ یعنی دہلی

علہ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۱

عہ مکاتیب غالب صفحہ ۲۵ حاشیہ (۱)

عہ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۰

عہ مکاتیب غالب صفحہ ۸۵ (دیباچہ)

عہ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۱ ٭ عہ ایضاً صفحہ ۱۳۰

میں رہیں تو صرف سو روپیہ تنخواہ اور رام پور میں رہیں تو سو روپیہ دعوت کا ملا کر دو سو روپیہ ماہوار۔ رام پور کی آب و ہوا وغیرہ سب کچھ میرزا کے خاطر خواہ تھی۔ اور ان کا ارادہ تھا کہ گرمی اور برسات رام پور ہی میں رہیں۔ مگر صاحبزادوں نے واپس دہلی پہنچنے کے لئے ضد کی۔ میرزا نے انہیں تنہا بھیجنے میں قباحت دیکھی اور خود بھی ان کیساتھ چلے آنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر نواب صاحب سے اجازت لے کر ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو رامپور سے روانہ ہوئے اور ۲۴ مارچ (۳۰ شعبان ۱۲۷۶ھ) کو دہلی پہنچے۔ جس دن دہلی پہنچے اسی دن رمضان کا چاند ہوا۔[۵۱]

پنشن کا اجرا

مارچ ۱۸۵۹ء میں میرزا کو پنشن کے حساب میں صرف سو روپیہ ملا تھا۔ حالانکہ دوسرے پنشنداروں کو سال سال بھر کا روپیہ بطور مدد خرچ ملا تھا۔ انہیں امید تھی کہ اس کے بعد جلد ہی مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر پچھلا تمام چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا۔ مگر نہ معلوم کیا پیچ پڑا کہ نہ صرف پچھلا روپیہ ہی نہ ملا۔ بلکہ جنوری ۱۸۶۰ء میں انہیں وہ مایوس کن جواب ملا جس سے گھبرا کر وہ عازم رام پور ہوگئے۔ اگرچہ وہ وہاں نواب صاحب کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے۔ مگر جیسا کہ انہوں نے منشی شیو نرائن کو لکھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ نواب صاحب کے ذریعے حکومت سے اپنی صفائی کرالیں۔[۵۲] نواب صاحب نے بھی وقتاً فوقتاً انگریزوں سے ہنگام ملاقات ان کا ذکر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں[۵۳]

---

۵۱ اردوئے معلی صفحہ ۲۵۵

۵۲ ایضاً صفحہ ۲۵۱

۵۳ مکاتیب غالب صفحہ ۲۳ حاشیہ (۲)

"مشفقا! ہنگامِ ملاقات کے اکثر صاحبانِ ذی شان سے تذکارِ محامد و اوصافِ ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانی سرکارِ دولت مدار سے یقینِ واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں۔ پیشگاہِ گورنمنٹ سے بھی اوسی مطابق ظہور میں آویگا۔ کس واسطے کہ سرکارِ ابدقرار قدردان اور قدر شناس ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نواب صاحب بھی کوشش کر رہے تھے۔ اور مرزا نے یوسف میرزا کو جب یہ لکھا[۵۱] کہ "والیٔ رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں یہ کام خدا ساز ہے۔ یہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا عطیہ ہے" تو یہ بھی شاعرانہ مبالغہ تھا۔ بہر حال کچھ ہو پنشن کا تمام روپیہ مئی ۱۸۶۰ء میں مل گیا۔ وہ اپریل ۱۸۵۷ء کی پنشن وصول کر چکے تھے۔ جب ۱۱ مئی کو غدر ہوا۔ ساڑھے سات سو کے حساب سے مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۶۰ء تک تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپیہ مدد خرچ کے وہ مارچ ۱۸۵۹ء میں لے چکے تھے۔ باقی دو ہزار ایک سو پچاس انہیں ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو ملے[۵۲]۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپیہ پھر بھی ان کے ذمہ قرض رہا اور ان کے پاس صرف ستاسی روپیہ گیارہ آنے بچے۔ ساتھ ہی یہ حکم ہوا کہ مئی کے مہینہ کے بعد پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ اور پنشن ماہ بماہ تقسیم نہ ہوا کرے[۵۳]۔ لیکن اس حکم پر عمل دسمبر ۱۸۶۰ء سے شروع ہوا۔

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴۶

[۵۲] ایضاً صفحہ ۶۶

[۵۳] ایضاً صفحہ ۲۹۷

اسکے علاوہ دوسرا حکم یہ ہوا کہ آئندہ چار روپیہ سینکڑہ سالانہ وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے گویا انہیں اس کے بعد ساڑھے باسٹھ کی جگہ صرف ساٹھ روپیہ ماہوار ملتے رہے۔[۵۱]

دربار و خلعت کا اجرا میرزا کی عمر تیس برس کی تھی جب ۱۸۲۸ء میں بعہد لارڈ بینٹنک انہیں دربار کا اعزاز ملا۔ خلعت کا اعزاز لارڈ الن برا کے عہد (۱۸۴۲ء لغایت ۱۸۴۴ء) میں ملا۔ جو سات پارچہ اور تین رقوم جواہر جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید پر مشتمل تھا۔ وہ ۲ نومبر ۱۸۵۹ء کو نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکان کو لکھتے ہیں[۵۲]

"میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست دو دمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوسی یہاں آئے نہیں۔ (اس لئے میں ان کے کسی دربار میں شامل نہیں ہوا)۔"

میرزا جب ایسے دربار میں شامل ہوا کرتے تھے۔ تو وہ بطور نذر قصیدہ یا مدحیہ قطعہ یا کوئی نظم پیش کیا کرتے تھے[۵۳]۔ سرکاری مراسلات میں ان کا القاب "خاں صاحب

---

۵۱ اردوئے معلی صفحہ ۱۰۳

۵۲ مکاتیب غالب صفحہ ۲۱-۲۲۔ نیز اردوئے معلی صفحہ ۴۰۶

۵۳ اردوئے معلی صفحہ ۸۱

بسیار مہربان دوستان" ہوتا تھا۔ اور یہ افشانی کاغذ پر ہوا کرتی تھیں [۱]۔

جب مئی سنہ ۱۸۶۰ء میں پنشن جاری ہوگئی۔ تو انہوں نے دربار اور خلعت کیلئے کوشش شروع کی۔ چنانچہ یکم جون سنہ ۱۸۶۲ء کی درخواست میں انہوں نے لکھا کہ لارڈ ولیم بینٹنک کے عہد سے دربار کا اور لارڈ الن برا کے عہد سے مجھے خلعت ہفت پارچہ و سہ رقوم جواہر کا اعزاز حاصل تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس اعزاز و اکرام میں اضافہ ہوتا۔ مگر اب کہ میری عمر ۶۷ برس ہے (بحساب قمری) اس کے برخلاف وہ پہلا دربار و خلعت بھی چھن گیا ہے۔ میں غدر کے دنوں میں بھی وفادار رہا۔ میری پنشن کا اجراء ہی میری بے گناہی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ پھر نہ معلوم مجھ سے دربار کا حق کیوں چھین لیا گیا ہے۔ میرے معاملات کی تفتیش کی جائے اور اگر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ میں بے قصور ہوں تو میرا دربار و اعزاز و اکرام بحال کیا جائے۔

ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو دربار و خلعت بھی کھل گیا [۲]۔ میرزا اس کی تفصیل ایک خط میں یوں لکھتے ہیں [۳]:-

"غدر کے بعد پنشن جاری ہوگئی۔ لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہل دفتر نے بموجب حکم کے مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار اور خلعت واگزاشت ہوگیا۔ مگر دلی میں دربار نہیں، انبالے آؤگے

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۹۶ نیز مکاتیب غالب صفحہ ۳۸ حاشیہ (۲)

[۲] مکاتیب غالب صفحہ ۳۵

[۳] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۶

تو دربار میں لمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے، میں نے خبریں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا۔ میں دربار میں نہ گیا، دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔"

لیکن اس خط میں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے خط میں انہوں نے درست لکھا ہے کہ لارڈ الگن گورنر جنرل کے دربار انبالہ کی خبر اور اس میں شمولیت کی ترغیب خود سر رابرٹ منٹگمری نے دی تھی[عله] مگر میرزا بیماری کی وجہ سے انبالے نہ جاسکے۔ اور قصیدہ بذریعہ ڈاک بھیج دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان ہے کہ "غالب کی پنشن اور دربار و خلعت کی بحالی کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم نے خاص کوشش فرمائی تھی[عله]" واللہ اعلم

شاعرِ دربار کی تجویز

جن دنوں لارڈ الن برا یہاں گورنر جنرل تھے۔ وہ غالب، پر خاص عنایت فرماتے رہے۔ اسی عنایت سابقہ کو مدنظر رکھتے ہوئے میرزا نے غدر سے کچھ مدت پہلے ایک قصیدہ لارڈ الن برا کی خدمت میں ولایت بھیجا کہ وہ اسے حضرت ملکہ معظمہ کی خدمتِ عالیہ میں پیش کر دیں۔ اس پر انہیں وہاں سے جواب ملا کہ قاعدہ کے مطابق اب ایسی

عله اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۱ (اس خط کے آخر میں میرزا تاریخ میں ایک غلطی کر گئے ہیں۔ لکھا ہے ۱۳ رمضان مطابق ۴ فروری ۱۸۶۰ء (یہاں فروری کی جگہ مارچ چاہیئے۔)

عله الہلال بحوالہ غالب (مولانا مہر) صفحہ ۲۰۴

تمام چیزیں گورنر جنرلِ حال کے توسط سے آنا چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل کی وساطت سے ایک قصیدہ اور یہ درخواست ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کی کہ جیسے خسروانِ روم وایران اور دوسرے ممالک کے حکمران اپنے مدح خواں شعرا کو بخشش و بخشائش کے مختلف طریقوں سے نوازتے ہیں۔ ان کے منہ موتیوں سے بھرواتے اور انہیں سیم و زر میں تلواتے اور خزانے عطا کرتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ اس ثنا خوانِ قدیم کو بھی حضور ملکہ عالیہ کے دربار سے ایک خطاب عطا ہو۔ اور میری قدیم خلعت و پنشن میں بھی اضافہ کیا جائے۔ اس درخواست پر اگرچہ انہیں کوئی قطعی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن مسٹر کلارک بہادر کا جو جواب انہیں ملا وہ مایوس کن بھی نہ تھا۔ میرزا امید بھرا دل لئے بیٹھے تھے کہ غدر ہو گیا۔ اور وہ بساط ہی الٹ گئی[۵۱]۔

غدر کے دوران میں میرزا نے جو مختصر رسالہ دستنبو لکھا تھا۔ اس کے چند نسخوں کی جلدیں خاص اہتمام سے تیار کرا کے انہیں ہندوستان اور انگلستان کے اکابر کو بھیجا۔ اس کے بھیجنے کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ غلام غوث خاں صاحب میر منشی کو لکھتے ہیں[۵۲]۔

"اب سنئے ادھر کی ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریرِ وزیر عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔"

یہ خط ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھا تھا۔ اس سے اگلے دن ۳۱ جنوری کو خواجہ صاحب

---

۵۱ کلیاتِ نثر فارسی صفحہ ۱۹۸

۵۲ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۵

ہی کو ایک اور خط لکھا۔ اس میں خاص اس بات کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں علہ

"۲۰ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدہ کے صلہ اور جائزہ کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ الن برا علہ سائل نے بھجوایا ہے۔ خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے۔ جو حکم صادر ہو گا سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ اپریل خوشی اور توقع میں گذرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے (شامل دستنبو) کی جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمہ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔"

میرزا کو ان یاد دہانیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مزید خطاب و خلعت تو در کنار پہلا دربار و خلعت اور پنشن بھی جاری نہ ہوئے۔ آئندہ تین برس انہیں دوبارہ حاصل کرنے کی سعی میں صرف ہوئے۔ جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت جاری ہو گئے۔ تو انہیں پھر اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا۔ اس پر انہوں نے ۱۸۶۵ء کے آغاز میں دوبارہ درخواست دی کہ (۱) مجھے ملکہ عالیہ کا شاعر دربار مقرر کیا جائے۔ (۲) دربار میں اونچی جگہ دی جلئے اور (۳) میری کتاب دستنبو

علہ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۴

علہ یہاں میرزا غلطی سے لارڈ کیننگ کی جگہ لارڈ الن برا لکھ گئے ہیں۔ چونکہ پہلے انہوں نے قصیدہ لارڈ الن برا کے توسط سے بھیجا تھا۔ وہی ان کے ذہن میں رہا۔ صحیح لارڈ کیننگ ہے۔

کو حکومت اپنے خرچ سے شائع کرے۔ اس پر گورنر جنرل بہادر نے لفٹنٹ گورنر پنجاب سے ان کے متعلق رپورٹ طلب کی۔ چیف سکرٹری گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیاحضرت ملکہ کا تو نہیں البتہ میرزا غالب کو وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدہ کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو۔ سالانہ خلعت ضرور دیا جائے۔ اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب وغیرہ میں وہ قصیدہ پیش کریں۔ تو بے شک خلعت دیا جاسکتا ہے۔ اس سے میرزا غالب کی کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اور علوم شرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی۔ جو اس وقت بہت کم ۔۔۔ ہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں میرزا غالب کے رویہ کی پڑتال کی جائے۔ نیز ان سے دستنبو کا ایک نسخہ طلب کرکے اس پر بھی رائے لکھی جائے جب میرزا سے دستنبو کا نسخہ طلب کیا گیا ہے۔ اس وقت وہ رام پور میں تھے۔

رام پور کا دوسرا سفر

دوسرے سفر رام پور کی تقریب یہ تھی کہ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب یوسف علی خاں بہادر نے انتقال کیا۔ اور ان کی جگہ ان کے فرزند اکبر نواب کلب علی خاں بہادر مسند نشین ریاست رام پور ہوئے۔ میرزا نواب فردوس مکان کی تعزیت اور نواب حال کی تہنیت کے لئے ۶ اکتوبر ۱۸۶۵ء شنبہ کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوئے[ع] ملازموں

ع اردوئے معلی صفحہ ۲۱۸۔ انہوں نے حکیم احمد حسن مودودی کے نام ایک خط میں لکھا ہے "ہفتم اکتوبر کو دلی سے رامپور کو روانہ ہوا" (صفحہ ۱۸۱) یہ غلط ہے۔ ہفتم کو یکشنبہ تھا۔ یہاں وہ تاریخ بھول گئے۔ کئی خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شنبہ کے دن دلی سے روانہ ہوئے۔

کے علاوہ ان کے اس سفر میں بھی باقر علی خاں اور حسین علی خاں ساتھ تھے۔ بعد قطع منازل ستنہ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو جمعرات کے دن رام پور پہنچے۔ "نواب خلد آشیاں نے تعظیم، تواضع، اخلاق کسی بات میں کمی نہیں کی" جرنیل کی کوٹھی اقامت کے لئے عطا ہوئی ۔ع۵ پہلے صبح و شام دونوں وقت کا کھانا شاہی مطبخ سے آتا تھا جس میں کئی طرح کی کھانے کی چیزیں ہوتی تھیں۔ بعد میں سب کی نقدی ہوگئی۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں جشن تخت نشینی ہوا جس کی تفصیلات اردوئے معلیٰ کے متعدد خطوط سے معلوم ہوتی ہیں

دستنبو کا دوسرا ایڈیشن میرزا یہاں "جشن جمشیدی" سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہ حکومت پنجاب کی طرف سے انہیں حکم ملا۔ کہ اپنی کتاب دستنبو کا ایک نسخہ بغرض ملاحظہ چیف سکرٹری کے پاس بھیجیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رام پور میں میرزا کو پہلے ایڈیشن کا جو نسخہ دستیاب ہوا وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے بھیجا جا سکتا۔ چونکہ حکومت کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا اور میرزا کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اس لئے انہوں نے پہلے ایڈیشن کے اس نسخہ کو صحیح کر کے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ کے مطبع واقع شہر بریلی، میں طبع کرایا۔ اور اس دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ حکومت پنجاب کو بھیج دیا۔

درخواست کا فیصلہ حکومت کے میر منشی نے دستنبو کو دیکھ کر یہ رپورٹ کی کہ اس کی زبان پرانی قسم کی فارسی ہے۔ جواب

ع۵ مکاتیب غالب صفحہ ۱۰۱ (دیباچہ)

نامانوس اور بعید الفہم ہے۔ اس لئے حکومت کا اسے اپنے خرچ سے شائع کرنا بے سود ہے۔ اسی کے ساتھ غدر کے دوران میں غالب کے رویہ کی پڑتال بھی ہو رہی تھی۔ اس پر پھر وہی رپورٹ برآمد ہوئی جس میں میرزا سے ایک سکہ منسوب کیا گیا تھا۔ آخر تمام امور پر غور کر کے حکومت نے ۶ر جنوری ۱۸۶۶ء کو یہ فیصلہ کیا۔ کہ میرزا کو درباری شاعر بنانا مناسب نہیں۔ البتہ گورنر جنرل کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر لفٹننٹ گورنر پنجاب انہیں خلعت عطا کریں۔ یا انہیں دربار میں پہلے سے اونچی جگہ عطا کی جائے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

رام پور سے واپسی

باقر علی خاں اور حسین علی خاں رام پور سے ملازموں کے ساتھ ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو روانہ ہو گئے تھے میرزا خود اس کے چند روز بعد ۲۸ر دسمبر کو وہاں سے روانہ ہوئے[۵۵]۔ راہ میں ایک سخت حادثہ پیش آیا۔ بارش کے دن تھے۔ اور رام گنگا میں سیلاب تھا۔ میرزا صاحب خود پالکی پر تھے اور شاگرد پیشہ پیدل یا دوسری سواریوں پر۔ دریا پر کشتیوں کا عارضی اور کمزور پل تھا جو نہی ان کی پالکی دریا کے اس پار پہنچی۔ پانی کے ایک پر زور ریلے میں پل بہ گیا۔ ملازم تمام اسباب و زادِ راہ سمیت اُس کنارہ پر رہ گئے اور یہ اکیلے اِس کنارہ پر۔ گرتے پڑتے مشکل سے مراد آباد کی سرائے میں پہنچے اور ایک کمبل میں رات بسر کر دی۔ پیری و صد عیب۔ دسمبر کی سردی اور بارش۔ اس پر ناکافی کپڑوں کی مصیبت۔ بیمار ہو گئے۔ مولوی محمد حسن خاں صاحب صدر الصدور مراد آباد کو معلوم ہوا تو وہ اٹھوا کر اپنے ہاں لے گئے، اور

---

[۵۵] مکاتیب غالب صفحہ ۲۹۲

تیمارداری کی۔ ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچ کر انہوں نے ایک خط نواب کلب علی خاں بہادر کی خدمت میں لکھا جس میں حادثہ کی تفصیلات سے انکو اطلاع دی۔؎۵

"بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچا، بعد پالکی کے اتر آنے کے پل کا ٹوٹ جانا گاڑی، اسباب یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اس زمہریر میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، خیر جو اُن پر گذری وہ جانیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھیرا۔ بھو کا پیاسا کمبل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی۔

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اٹھا، صاحبزادہ ممتاز علی خاں کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے، او ٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے، صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رکھا۔ بھائی مصطفیٰ خاں بہادر وہیں مجھ سے آکر ملے۔ دوسرے دن وہ رہ کر آئے دارالسرور رامپور ہوئے اور میں جادہ نوردستم آباد دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ، ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء درِ غم کدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی۔ ورنہ میں اور جیتا دہلی پہنچتا۔ قطعہ

؎۵ مکاتیب غالب صفحہ ۶۵-۶۶

"مغلوبِ غلبۂ غمِ دل غالبِ حزیں — کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
از رام پور زندہ بدہلی رسیدہ است — مارا بدیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں ع۵۹:-

"لو صاحب یہ گھڑی کھائی دن بہلائے کپڑے پھاڑے گھر کو آئے ۔
۸ر جنوری ماہ و سال دوشنبہ کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا ۔ تمہارا خط مضامین دردناک سے بھرا ہوا رام پور میں میں نے پایا ۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی ۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا ۔ پانچ دن صدر الصدور کے ہاں پڑا رہا ۔ انہوں نے تیمارداری اور غمخواری بہت کی ۔"

آخری ایام غالب ایک مدت سے بیمار چلے آتے تھے ۔ ۱۸۵۸ء میں ان پر قولنج کا پہلا حملہ ہوا ۔ اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ سے یہ دورے آخر تک ہوا کئے ۔ ۱۸۶۱ء میں وہ اتنے کمزور تھے کہ جب نواب یوسف علی خاں فردوس مکان نے اپنے منجھلے صاحبزادے حیدر علی خاں بہادر کی رسم شادی میں شمولیت کے لئے دعوت دی تو انہوں نے کمزوری اور علالت کا عذر کر کے معافی چاہی ۔ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء کا بیشتر حصہ پھوڑوں اور زخموں کی تکلیف میں بسر ہوا "جتنا خون بدن میں تھا ۔ بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا ۔ سن کہاں جواب تولیدِ دمِ صالح ہو" ع۶۰ اگرچہ وہ اس علالت سے اچھے

ع۵۹ اردوئے معلیٰ صفحہ ۷

ع۶۰ ایضاً صفحہ ۱۵۶

ہو گئے۔ مگر صحت اس حد تک بحال نہیں ہوئی تھی کہ وہ تندرست کہلا سکیں۔ یہ صورت تھی۔ جب رام پور کے سفر سے واپسی پر یہ حادثہ جانکاہ پیش آیا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس کے بعد انہیں پوری صحت کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا۔ ۲ امئی ۱۸۶۶ء کو مولوی حبیب اللہ خاں کو لکھتے ہیں؂

"میرے محب۔ میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتواں تھا اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا۔ اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے۔ رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا۔ بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اوائل عمر کی بے اعتدالیوں اور شراب نوشی نے ان کی صحت کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ لیکن جب تک قوامدرست رہے۔ یہ اثرات نمودار نہیں ہوئے۔ جب کہولت کے بعد بڑھاپا شروع ہوا تو یک لخت آلام دنیوی نے انہیں گھیر لیا۔ آمدنی کم ہو گئی اور وہ اپنی خوراک اور آسائش کا پہلا معیار قائم نہ رکھ سکے۔ اس سے وہ مخفی اثرات سطح پر آ گئے اور انہیں طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر لیا۔ اس پر بھی ممکن تھا کہ وہ ابھی اور کچھ مدت زندہ رہتے مگر رام پور کے سفر میں جو حادثہ انہیں پیش آیا۔ اس نے ان کی موت کو قریب سے قریب تر کر دیا۔

وفات آخر وہ دن بھی آ گیا جس کی انہیں ایک مدت سے تمنا تھی۔ کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب میں پورے طور پر صحت یاب نہیں ہو سکتا اسلئے

؂ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۸

وہ موت کو اکثر یاد کیا کرتے تھے۔ اور یہ شعر عموماً ورد زبان رہتا تھا ؎

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو پیر کے دن آٹھ بجے صبح اس باکمال کا انتقال ہو گیا۔ جس نے اگر ایک طرف اس ملک میں علم و ادب فارسی کو نقطۂ معراج پر پہنچا دیا تو دوسری طرف اردو نظم و نثر کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کر کے ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی جس کی پیروی تو بہتوں نے کی مگر کامیابی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ الا ماشاءاللہ۔

جنازہ کی نماز دلی دروازہ کے باہر ہوئی۔ بعض شیعہ حضرات نے کہا کہ مرحوم شیعہ تھے۔ اسلئے ہمیں اپنے طریقہ پر ان کی تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے۔ مگر نواب ضیاءالدین احمد خاں بہادر نیّر رخشاں نہ مانے اور انہیں اہل تسنن کے طریقہ پر ہی دفن کیا۔ قبر سلطان جی میں خاندان لوہارو کے قبرستان میں ہے۔ جہاں اس خاندان کے اور افراد بھی دفن ہیں۔ میرزا حیرت نے لکھا ہے[ع] کہ اس احاطہ کی پختہ چار دیواری میرزا غالب کے کسی ہندو شاگرد نے بنوائی تھی۔ میں اس بیان کی کہیں سے تصدیق نہیں کر سکا۔ واللہ اعلم۔

لوحِ مزار پر میرزا کے محبوب شاگرد میر مہدی مجروح کا قطعہ تاریخ ہے۔ پورا کتبہ یہ ہے۔

ع ’چراغ دہلی‘ صفحہ ۳۶

یاحی یاقیوم

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد — اسد اللہ خانِ غالب مرد
کل میں غم و اندوہ میں باخاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"
۱۲۸۵ھ

اولاد اور خاندان میرزا کے اپنے سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔[۱]

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی کا نام بنیادی بیگم تھا اور چھوٹی کا امراؤ بیگم۔ چھوٹی میرزا غالب کے نکاح میں آئیں اور بڑی نواب غلام حسین[۲] خاں مسرور سے منسوب تھیں۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ نواب زین العابدین خاں عارف اور نواب حیدر حسین خاں۔ جب میرزا غالب کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہ رہا تو انہوں نے نواب زین العابدین خاں عارف کو متبنیٰ کر لیا۔ عارف نہایت خوش گو شاعر تھے۔ میرزا ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ اور طرزِ سخن میں میرزا ہی کے پیرو تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے میرزا کو بہت عزیز تھے۔ مگر افسوس کہ میرزا کو ان کی جوانا مرگی کا داغ بھی اٹھانا پڑا۔ اس جوان صالح کا جسے

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵

[۲] نواب غلام حسین خاں بیٹے تھے شرف الدولہ نواب فیض اللہ خاں بہادر سہراب جنگ ابن نواب قاسم جان کے۔ اور قاسم جان بھائی تھے نواب عارف جان کے جن کی اولاد میں نواب احمد بخش خاں اور نواب الٰہی بخش خاں تھے۔

میرزا "راحتِ روحِ ناتوان" اور "شمعِ دودمان" کہتے تھے۔ عین عالمِ شباب میں (اپریل ۱۸۵۲ء مطابق جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) بعارضۂ رعاف و اسہال انتقال ہوگیا[۱]۔ انتقال کے وقت عمر صرف ۳۵ برس تھی[۲]۔

میرزا غالب کو عارف کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ اسی موقعہ پر انہوں نے وہ دردناک اور مشہور نوحہ لکھا جس کا پہلا شعر ہے۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

---

[۱] تذکرۂ گلستانِ سخن (میرزا قادر بخش صابر)۔ عارف مرحوم کا جو قلمی دیوان نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے پوتے اور نواب شجاع الدین احمد خاں ثاقب کے صاحبزادے میرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں مرحوم کے خاندان میں محفوظ ہے۔ اس کے آغاز میں جناب نیر رخشاں کے دوسرے صاحبزادے جناب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ ہم جناب تاباں مرحوم کی بیگم صاحبہ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں یہ دیوان دیکھنے کو دیا۔ اسی دیباچہ سے معلوم ہوا۔ کہ ان کا انتقال بعارضہ رُعاف و اِسہال جمادی الثانی میں ہوا تھا۔

[۲] منشی کریم الدین کے تذکرہ "طبقات الشعرا" کی تالیف کے وقت (۱۲۶۳ھ میں) عارف کی عمر ۳۰ برس تھی۔ ظاہر ہے کہ پانچ برس بعد ۱۲۶۸ھ میں ان کی عمر ۳۵ برس ہوگی۔

عارف کے شاگرد الگزنڈر ہڈرلے[5] نے ایک دردناک مرثیہ لکھا جس میں تاریخ "سرِ پاس" کے تخرجہ کے بعد اس مصرع سے نکالی ہے ع

عارف پسندِ رحمتِ حق ہو چکا ہے آج

عارف کی اولاد

عارف نے دو نکاح کئے۔ پہلا نواب شمس الدین احمد خاں کی سگی ہمشیرہ نواب بیگم سے اور دوسرا نواب بیگم کی وفات کے بعد۔ میرزا محمد علی بیگ بخارائی کی صاحبزادی لیتی بیگم عرف نواب دلہن سی ہوا۔

---

[5] الگزنڈر ہڈرلے آزاد۔ ان کے باپ ایک فرانسیسی نژاد شخص جیمز ہڈرلے تھے۔ جیمز نے ایک مسلمان خاتون سے شادی کرلی تھی جس کے لطن سے الگزنڈر پیدا ہوئے۔ الگزنڈر ہڈرلے فوج میں ملازم تھے۔ پہلے کچھ مدت ریاست جھجر میں رہے۔ اسکے بعد الور چلے گئے وہاں محکمہ توپ خانہ میں کپتانی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ طب میں بھی یدطولی حاصل تھا۔ مریضوں کو دوائیاں مفت تقسیم کیا کرتے تھے۔ الور ہی میں تھے کہ ۳۲ برس کی عمر میں ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو وفات پائی۔

شاعری میں عارف سے تلمذ تھا۔ میرزا غالب کے خطوں میں ان کا اکثر ذکر آیا ہے کہیں پورا نام ہے۔ کہیں الک صاحب جو الگزنڈر کا مخفف ہے۔ خود آزاد نے بھی ایک شعر میں لکھا ہے۔

ہوے جو کوئی اے الک ساتھ ہو کیونکہ گلستاں   سینۂ داغدار تو اپنا اسے دکھا کہ یوں

آزاد کی موت کے بعد ان کے بڑے بھائی طامس ہڈرلے نے مرحوم کے دوست منشی شوکت علی کی مدد سے دیوان جمع کیا اور ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی آگرہ سے شائع کیا۔ شروع میں دو دیباچے ہیں۔ منشی شوکت علی کا فارسی میں اور طامس ہڈرلے کا اردو میں۔ اس کے بعد قصاید ہیں پھر غزلیات اور قطعات وغیرہ۔ سارا کلام نہایت پختہ ہے۔

اس شادی سے ان کے دو بچے ہوئے۔ بڑے کا نام باقر علی خاں تھا اور چھوٹے کا حسین علی خاں۔ بستی بیگم عارف سے تین چار ماہ پہلے فوت ہوئیں جب ۱۸۵۲ء میں عارف کی وفات ہوئی تو میرزا غالب حسین علی خاں کو اپنے گھر لے آئے[1] جو اس وقت صرف دو برس کے تھے۔ باقر علی خاں بدستور اپنی جدہ ماجدہ بنیادی بیگم کے پاس رہے۔ مگر بنیادی بیگم بھی عارف کی موت کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہیں۔ اور اس کے بعد باقر علی خاں بھی میرزا کے پاس آ گئے۔

میرزا باقر علی خاں

میرزا باقر علی خاں اپنے والد کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے۔ انکا نکاح میرزا غالب کی زندگی ہی میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی صاحبزادی جناب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم صاحبہ[2] سے ہوا۔

---

[1] میرزا نے دستنبو میں لکھا ہے کہ ان دونوں بچوں کو میرے گھر آئے کم و بیش پانچ برس ہوئے ہیں۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں حسین علی خاں آئے۔ اور بڑے بھائی اس کے بعد۔ (کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۹۷)۔

[2] جناب بگا بیگم صاحبہ کی عمر اسوقت ۸۸ برس کے قریب ہے۔ کبر سنی کی وجہ سے ثقل سماعت کا عارضہ ہے۔ مگر حافظہ ابھی تک بہت اچھا ہے۔ میرزا کے خاندان کے حالات کی کئی تفصیلات اور متعدد ناموں کی تحقیق انہیں سے ہوئی۔ میں نواب علاؤ الدین احمد خاں بہادر علائی مرحوم کے صاحبزادے نواب ضمیر الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے جناب بیگم صاحبہ سے میرا تعارف کرایا۔ مرزا محمد حسن خاں عرف مرزا خضر کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے۔ جنھوں نے نواب ضمیر مرزا صاحب سے ملاقات میں رہنمائی کی۔ جناب مرزا خضر، نواب (باقی صفحہ ۷۱ کے نیچے ملاحظہ فرمائیے)

شادی کے وقت میرزا باقر علی خاں کی عمر ۱۷ برس تھی اور جناب بگاّ بیگم صاحبہ کی ۱۲ برس۔ اولاد میں صرف تین صاحبزادیاں ہوئیں۔ فرزند نرینہ کوئی نہیں ہوا۔

سب سے بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم صاحبہ عرف چندو بیگم ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں پیدا ہوئیں۔ میرزا غالب انہیں ہمیشہ لڑکے کی طرح پیار کرتے اور میرزا جیون بیگ کہہ کر پکارتے تھے۔ سبد چین میں ان کی ولادت کا قطعہ تاریخ موجود ہے۔

سروشِ تہنیت زیادۂ مطالب گفت	بہ من زمقدمِ فرزندِ میرزا باقر
طریقِ تعمیہ ورزید وجانِ غالب گفت	چو "فصد" شد متعلق بہ گفتنِ تاریخ

اس قطعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے گویا کسی فرزندِ نرینہ کی تاریخ ہے ۱۲۸۱ھ۔ دراصل یہ اسی صاحبزادی کی تاریخ ولادت ہے۔ ان کا نکاح میرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں مرحوم سے ہوا۔ افسوس کہ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

میرزا باقر علی خاں کی دوسری صاحبزادی جناب فاطمہ سلطان بیگم صاحبہ عرف بندو بیگم تھیں۔ ان کا نکاح نواب علائی مرحوم کے صاحبزادے میرزا بشیر الدین احمد خاں مرحوم سے ہوا تھا۔ ان کی اولاد موجود ہے۔

تیسری صاحبزادی جناب رقیہ سلطان بیگم صاحبہ عرف چھٹن بیگم ہیں۔ ان کا نکاح کرنل زیڈ احمد (ذوالنور علی احمد) صاحب سے ہوا۔ ان کی اولاد بھی موجود ہے۔

(بسلسلہ حاشیہ صفحہ ۷۰) زین العابدین خاں عارف کے سگے بھتیجے اور میرزا حیدر حسین خاں مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۶ برس ہے۔ خدائے قیوم انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے۔

میرزا باقر علی خاں شعر بھی کہتے تھے۔ کامل تخلص تھا۔ غالب کے شاگرد میرزا قربان علی بیگ خاں سالک سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ میرزا غالب ابھی زندہ تھے کہ وہ بیس برس کی عمر میں مہاراجہ الور کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ وہاں سے ساٹھ روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ مگر وفات سے دو تین برس پہلے ملازمت ترک کر کے دہلی چلے آئے اور گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے تھے۔ حیدر آباد سے بھی بلاوا آیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہاں جانا نصیب نہ ہوا اور موت کا بلاوا آ گیا۔ ان کا انتقال یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ (۲۵ مئی ۱۸۷۶ء) کو ہوا۔ وفات کے وقت عمر صرف ۲۸ برس اور چھ ماہ تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مدفن سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائینتی اپنی خاندانی ہڑواڑ میں ہے۔ لوحِ مزار پہ یہ تاریخ لکھی ہے۔

ھوالغفور

چو زیں غم خانۂ دنیا سفر کرد
سوئے باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش تحریر گردید
بود مینو مکاں باقر علی خاں
۱۲۹۳ھ

میرزا حسین علی خاں میرزا حسین علی خاں اپنے بھائی سے تین برس چھوٹے تھے۔ ان کا سن پیدائش ۱۸۵۰ء ہے۔ غالب ان کو بہت عزیز رکھتے اور ان کے ہر طرح کے لاڈ چاؤ برداشت کرتے تھے۔ حسین علی خاں کا نکاح غالب کی زندگی میں نہیں ہوا۔ نسبت قرار پا چکی تھی۔

فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر کے ایک بھائی نبی بخش خاں بہادر تھے۔ ان کے پوتے مرزا اکبر علی خاں نے جنرل اختر لونی کی صاحبزادی[عله] سے نکاح کر لیا تھا۔ اس نکاح کا نتیجہ ایک لڑکی خورشید بیگم تھیں جو مرزا حسین علی خاں سے منسوب تھیں۔ میرزا غالب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس شادی کے انتظام کے لئے نواب کلب علی خاں خلد آشیاں سے مدد مانگ رہے تھے۔ نواب خلد آشیاں نے مدد کا وعدہ کیا تھا، اسی زمانہ میں میرزا کے اپنے قرض خواہوں نے انہیں تنگ کرنا شروع کیا۔ ان کا سہارا لے دے کے ایک دربار رام پوری تھا۔ انہیں اس میں شرم محسوس ہوئی کہ اپنے آٹھ سو روپیہ قرض کے ادا کرنے کیلئے بھی مدد مانگوں اور حسین علی خاں کی شادی کے لئے بھی روپیہ طلب کروں۔ آخر انہوں نے درخواست دی کہ میں فی الحال حسین علی خاں کا نکاح نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے صرف آٹھ سو روپیہ عطا کیا جائے کہ میں قرض سے سبکدوش ہو جاؤں[عله۲]۔

عله جنرل اختر لونی نے ایک عورت مبارک بیگم سے شادی کر لی تھی۔ اسی مبارک بیگم کی بنائی ہوئی وہ مسجد ہے جو دہلی میں حوض قاضی کے پاس بازار سرکی والان میں تھانہ کے متصل موجود ہے۔ یہ پوری سنگ سرخ کی بنی ہے اور اسی لئے لال مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ پیش طاق پر یہ قطعہ سنگ مرمر کی تختی پر کندہ کیا ہوا موجود ہے۔

مبارک بیگم ایں مسجد بنا کرد	کہ باشد برتر از چرخ مقوّس
کلم از بیت المقدس نسبت شانش	بگو ایں ثانی بیت مقدّس

مزید تفصیلات کیلئے دیکھو واقعات دار الحکومت دہلی (مولوی بشیر الدین احمد) حصہ دوم صفحہ ۳۳۹

عله۲ مکاتیب غالب صفحہ ۱۰۱

مگر افسوس کہ ان کی کوئی آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔ ابھی وہ قرض بھی ادا نہ کر سکے تھے کہ فروری ۱۸۶۹ء میں پیام اجل آپہنچا۔

مرزا حسین علی خاں اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں شاداں اور فارسی میں خیالی تخلص تھا۔ میرزا غالب کی وفات کے بعد وہ رام پور چلے گئے وہاں سے پچیس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ مگر نہ معلوم کیوں ملازمت چھوڑ دہلی چلے آئے۔ بڑے بھائی کی وفات کا انہیں بہت صدمہ ہوا اور اس کے بعد صحت خراب رہنے لگی آخر، ستمبر ۱۸۸۰ء (یکم شوال ۱۲۹۷ھ) کو ان سے چل لے۔ وفات کے وقت عمر تیس برس کے قریب تھی۔

بیگم کی وفات

میرزا کی وفات کے بعد جناب امراؤ بیگم پر گویا غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خاندانی پنشن جو خزانہ سرکار سے ملتی تھی۔ وہ بند ہو گئی۔ رام پور کا وظیفہ بھی بند ہو گیا۔ بیوگی کا غم جدا۔ ذرائع آمدنی کا بند ہونا اس کے علاوہ اور میرزا مرحوم کے قرضخواہوں کے تقاضوں کی کوفت سب پر مستزاد۔ آخر انہوں نے یکم اگست ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں لکھا کہ آٹھ سو روپیہ میرزا صاحب مرحوم کا قرض باقی ہے۔ مدد فرمائی جائے۔ جب ایک ماہ تک اس درخواست پر کوئی حکم صادر نہ ہوا تو انہوں نے دو ستمبر ۱۸۶۹ء کو دوبارہ لکھا۔ اس پر ۹ ستمبر کو حکم ہوا۔ کہ رقم مطلوبہ بھیج دی جائے [۵]

امراؤ بیگم صاحبہ نے سرکار انگریزی میں بھی درخواست دی تھی۔ کہ

---

[۵] مکاتیب غالب۔ صفحہ ۲۱۔۲۲ (دیباچہ)

میرزا صاحب مرحوم کی پنشن ان کے متبنیٰ بیٹے میرزا حسین علی خاں کے نام جاری کردی جائے۔" ڈپٹی کمشنر دہلی نے رپورٹ خاطر خواہ کی۔ مگر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ متبنیٰ کی پنشن نہیں ہو سکتی۔ ہاں زوجہ کے واسطے مبلغ دس روپیہ تجویز ہوں گے ...... بشرط اینکہ وہ کچہری میں حاضر ہوں۔"ؑ۵ یہ شرط بیگم صاحبہ نے منظور نہ کی۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوشش اس کے بعد بھی جاری رہی۔

جناب معظم زمانی بیگم صاحبہ کا بیان ہے کہ ان کی وفات عین میرزا صاحب مرحوم کے برسی والے دن (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۴ فروری ۱۸۷۰ء) ہوئی۔" ہم لوگ برسی کے انتظامات میں مصروف تھے کہ انہوں نے دس گیارہ بجے دن کو انتقال فرمایا۔ پنشن کا حکم آچکا تھا مگر لینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔" انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ بس باقی ہوس۔

ؑ۵ مکاتیب غالب صفحہ ۲۰-۲۱ (دیباچہ)

تصنیفات

۱- فارسی

کلیاتِ نثر کلیاتِ نثر فارسی میں تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ۔ مہر نیم روز اور دستنبو۔ یکجا شائع ہونے سے پہلے بھی مختلف اوقات میں ان کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

۱- پنج آہنگ پنج آہنگ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ آہنگِ اول، القاب و آداب اور ان کے متعلقہ مراتب، آہنگِ دوم، مصادر و مصطلحات و لغاتِ فارسی۔ آہنگِ سوم، اشعار مکتوبی منتخب از دیوان غالب۔ آہنگِ چہارم، خطب کتب و تقاریظ و عبارات متفرقہ۔ آہنگِ پنجم مکاتیب۔

میرزا علی بخش خاں رنجور، پنج آہنگ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، کہ جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کی وفات کے بعد جے پور سے دہلی پہنچا، تو میرزا غالب کا دیوان فارسی موسوم بہ میخانۂ آرزو مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں کی نثر کو میں نے میرزا سے پڑھا تو میرے دل میں خیال گزرا کہ اس نثر اور دوسری متفرق فارسی عبارتوں کو یکجا کر دینا چاہیے۔ مگر مکروہات نے اجازت نہ دی، کہ ایسا کرتا حتیٰ کہ حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر نے تحریک کی کہ ان اوراق کو ضرور جمع کر دیا جائے۔ میرے ہم سبق میر محمد حسین خاں صاحب بھی میرا ہاتھ بٹانے پر تیار ہو گئے۔ تب مجھے بھی خیال گزرا کہ اگر یہ جمع ہو جائیں تو میرا

لڑکا غلام فخرالدین خاں ان سے مستفید ہوگا۔ لہٰذا میں نے اس کام پر کمر ہمت باندھ لی۔"

آہنگِ اول و دوم و سوم کا زمانۂ تصنیف ۱۸۲۵ء ہے۔ جب اس سال انگریزوں نے بھرت پور کے قلعہ پر چڑھائی کی تو فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر بھی انگریزوں کی طرف سے شاملِ جنگ تھے۔ اس معرکے میں غالب اور رنجور دونوں ان کے ہم رکاب تھے۔ رنجور نے غالب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر آپ تمام ایسے کلمات جمع کر دیں جو رسمی خطوں میں "القاب و آداب اور شکر و شکوہ و شادی و غم" کے اظہار کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو بہت مفید ہوگا۔ اس پر میرزا نے آہنگِ اول و دوم تحریر کئے۔ بعد میں آہنگِ سوم لکھا۔ اس میں اپنے دیوان سے انتخاب کر کے وہ اشعار جمع کر دئے جو خطوط و مکتوبات وغیرہ میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

یوں تو مختلف حیثیتوں سے پانچوں حصے ہی قابلِ قدر ہیں لیکن آہنگِ پنجم خصوصاً بہت اہم چیز ہے۔ کیونکہ اس میں میرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں، جو انہوں نے غدر سے پہلے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اس سے ان کی زندگی کے اس زمانہ کے حالات معلوم ہوتے ہیں جس کے لئے ہمارے پاس اور کوئی ماخذ نہیں۔

پنج آہنگ دو دفعہ علیحدہ چھپی۔ ایک بار قلعہ کے مطبع سلطانی میں اور دوسری دفعہ منشی نورالدین کے چھاپہ خانے میں[۵]۔ منشی نورالدین کے مطبع والا

---

[۵] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶۹

نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ دوسرا نسخہ میں نے دیکھا ہے۔ اس پر تاریخ طباعت ۴ ؍ اگست ۱۸۴۹ء (۱۴ ؍ رمضان ۱۲۶۵ھ) درج ہے۔ یہ حکیم غلام نجف خاں بہادر کی تصحیح و ترتیب اور اہتمام سے شائع ہوا تھا۔

مگر جیسا کہ میرزا نے خود لکھا ہے یہ مجموعہ نثر مکمل نہیں۔ ان تحریروں کے علاوہ بھی جو غدر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں اور حسین میرزا کے کتب خانوں سے ضائع ہو گئیں، بعض اور چیزیں ادھر اُدھر منتشر پڑی ہیں جو اس میں شامل نہیں۔

۲۔ مہر نیم روز میرزا ۴ ؍ جولائی ۱۸۵۰ء کو تاریخ نگاری کی خدمت پر مامور ہوئے[۵۱]۔ وہ ۱۱ ؍ جون ۱۸۵۲ء کو منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھتے ہیں[۵۲]:

"مسودۂ روز نامۂ روداد اور نگ نشینانِ چغتائیہ بدست ہیرا سنگھ زاں داشتہ ایم و ہنوز از رسید نش نشان نیافتہ ام، اگر رسیدہ است بنویسند ورنہ از ہیرا سنگھ باز پرس کنند۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اگر مسودہ تاریخ ۱۱ ؍ جون سے پہلے جوہر کو بھیجا جا چکا تھا۔ تو اسے ایک دو ماہ اس سے پیشتر ختم ہو جانا چاہیئے۔ ایک دوسرے خط سے جو مولوی رجب علی صاحب کے نام لکھا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مہر نیم روز مارچ ۱۸۵۲ء سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ مگر اس کے چھپنے کی نوبت دو برس

---

[۵۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۷۶

[۵۲] اردوئے معلی صفحہ ۱۲۰

تک نہیں آئی - یہ پہلی بار ۱۲۷۱ھ (۵۵-۱۸۵۴ء) میں فخر المطابع میں چھپی۔ (دوسری بار پچھلے دنوں لاہور سے پروفیسر اولاد حسین شاداں کی تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ مطبع کریمی سے شائع ہوئی ہے۔)

۳- دستنبو دستنبو غدر کے پرآشوب ہنگامہ کے دوران میں لکھا گیا۔ میرزا جو کچھ لکھتے جاتے تھے - ساتھ کے ساتھ اس کی ایک نقل میر مہدی مجروح کو بھی بھیج دیتے تھے۔ "ممکن ہے وہ ابھی اور زیادہ لکھتے" مگر منشی امید سنگھ اندور والے میرزا کی ملاقات کو آئے اور انہوں نے دستنبو کا مسودہ دیکھکر اسے چھاپنے کا قصد کیا۔" اس لئے انہوں نے یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات لکھکر کتاب ختم کر دی۔ میر مہدی کو لکھتے ہیں ؂

"صاحب ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آگے لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرۂ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تا کہ میں اس کے آگے کی عبارت تم کو لکھکر بھیجدوں۔"

میرزا نے کتاب کا مسودہ ستمبر میں منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس آگرہ بھیجدیا تھا۔ وہاں تفتہ کے علاوہ غالب کے دو اور مخلص دوست منشی نبی بخش حقیر اور میرزا حاتم علی مہر بھی تھے۔ مطبع مفید خلائق کے مالک منشی شیو نرائن بھی ان کے عزیزوں میں سے تھے۔ ان چاروں حضرات نے دستنبو کی اشاعت کے تمام مراحل کی نگرانی

؂ اردوئے معلی صہ ۱۴۱

کی۔ پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق سے نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتہ میں چھپ کر بازار میں آیا۔ اس میں صرف پانسو نسخے چھپے تھے اور ۸ر قیمت تھی۔ یہ پورا ایڈیشن پانچ ماہ کی مدت میں ختم ہوگیا۔ میرزا منشی شیو نرائن کو۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں:[۵]

"دیکھو صاحب تم گھبراتے تھے۔ آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی"

اس کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں چھپا۔ میرزا ان دنوں رام پور میں تھے۔ کہ حکومت پنجاب نے ان سے اس کا ایک نسخہ طلب کیا۔ کیونکہ میرزا نے درخواست دے رکھی تھی کہ دستنبو کو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ میرزا صاحب نے ایک نسخہ صحیح کرکے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ کے مطبع واقعہ بریلی میں چھپنے کو بھیجا۔ بریلی کے قاضی عبدالجمیل صاحب میرزا کے شاگرد اور عزیز تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایڈیشن انہیں کی نگرانی میں شائع ہوا ہوگا۔ اس نسخہ کے خاتمہ کی عبارت ہے:۔

للہ الحمد کہ کتاب افادت انتساب بفرہنگ ودانش مرسوم وبدستنبوئی موسوم چکیدۂ قلمِ جادو رقم ..... نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب عرف میرزا نوشہ مد اللہ ظلال فیوضہ باہتمام منشی چندن لال صاحب در قالب طبع آمد واز نسخہ صحیحہ مرسلہ مصنف صاحب نقل شد و تصحیح تمام در ۱۸۶۵ء حسن اختتام یافت۔

تیسرا ایڈیشن بھی اسی مطبع سے ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔

ان دونوں ایڈیشنوں میں ترتیب بدل دی گئی تھی۔ پہلے ایڈیشن کے آغاز

---

[۵] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷۳

ہیں میرزا کا قصیدہ تھا جو انہوں نے ملکہ معظمہ کی مدح میں لکھا تھا۔ شمار یافت۔ روزگار یافت۔ اور اس کے بعد اصل دستنبو تھا۔ دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں پہلے دستنبو کی نثر اور آخر میں یہ قصیدہ ہے اور اس کے علاوہ وہ قطعہ ہے۔ روزگار چراغاں اشتہار چراغاں۔ جو انہوں نے دہلی کی فتح کی خوشی میں چراغاں کے موقعہ پر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔

کلیاتِ نثر کی اشاعت جیسا کہ میرزا نے کلیات نثر میں پنج آہنگ کے خاتمہ پر لکھا ہے ۱۲۸۰ھ میں منشی نولکشور صاحب دہلی آئے اور میرزا کی ملاقات کے لئے گئے۔ انہوں نے کلیات نثر چھاپنے کی اجازت چاہی میرزا نے یہ تینوں کتابیں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں سے لے کر منشی صاحب موصوف کو دیں۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔ جہاں ان کے مشہور مطبع نولکشور سے یہ کلیات پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء (رمضان ۱۲۸۴ھ) میں شائع ہوا۔

اس کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بھی اسی مطبع سے بالترتیب ۱۸۷۱ء اور ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔

۴۔ قاطع برہان میرزا جب غدر کے دنوں میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے، تو ان کے پاس چھاپے کی "برہان قاطع" کا ایک نسخہ تھا۔ یہ مولوی محمد حسین تبریزی کی لکھی ہوئی لغت فارسی کی مشہور کتاب ہے۔ میرزا نے فرصت کے اوقات میں اس کا مطالعہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ اس میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ وہ اس کتاب کے حاشیہ پر اعتراض لکھتے رہے[۵] اور آخر میں انہیں مرتب کر کے "قاطع برہان"

ع۵ "برہانِ قاطع" کا وہ نسخہ جو ایام غدر میں میرزا کے مطالعہ میں تھا اور جس کے حاشیہ پر انہوں نے اپنے اعتراضات لکھے تھے۔ اب بھی ریاست لوہارو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

کے عنوان سے لکھوالیا۔ اگرچہ کتاب ۱۸۶۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ مگر اس کے چھپنے کے سامان دو سال تک پیدا نہ ہوئے۔ آخر ۱۸۶۲ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر کی مدد سے اس کا پہلا ایڈیشن مطبع نولکشور سے شائع ہوا۔ اس کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ خود میرزا نے اس کے پچاس نسخے خرید کر دوستوں میں تقسیم کئے تھے۔

درفش کاویانی قاطع برہان میں مزید مطالب و اعتراضات کا اضافہ کرکے میرزا نے اسے دوسری بار دسمبر ۱۸۶۵ء میں چھپوایا۔ اور اس کا نام درفش کاویانی رکھا۔ یہ ایڈیشن مطبع اکمل المطابع میں چھپا تھا۔ اور اس کی چھپائی میں میر غلام بابا خاں رئیس سورت نے انہیں مدد دی تھی۔ پہلے ایک گھڑی بھیجی[۱] اور پھر سو روپے[۲]۔ اس ایڈیشن کے صرف تین سو نسخے چھپے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان میں سے ڈیڑھ سو میر صاحب موصوف کی نذر کریں[۳]۔ مگر انہوں نے لکھ دیا کہ اتنے نسخے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اس اطلاع کے ملنے سے پہلے میرزا ۳۶ نسخے ان کو بھیج چکے تھے۔ اس کے بعد پھر انہوں نے کوئی کتاب نہیں بھیجی[۴]۔

۵۔ کلیاتِ نظم فارسی جیساکہ میرزا علی بخش خاں رنجور نے کلیاتِ نثر فارسی کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ میرزا کا فارسی کلام ۱۸۳۵ء میں میخانۂ آرزو کے عنوان سے مرتب ہو چکا تھا۔ مگر اصل میں اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء

---

[۱] اردوئی معلی صہ۹، صہ۱۶

[۲] ایضاً صہ۲۲

[۳] ایضاً صہ۲۳

[۴] ایضاً صہ۱۸

میں شائع ہوا۔ یہ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کی تصحیح و ترتیب کے بعد مطبع دار السلام دہلی میں چھپا تھا۔[۵]

اس کے بعد کا جتنا کلام تھا۔ وہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پاس جمع ہوتا رہا۔ مگر غدر کی نادر گردی میں جب ان کا کتب خانہ لٹا تو اس میں میرزا کا کلام بھی ضائع ہو گیا ۱۸۶۲ء تک جو کچھ دوبارہ جمع ہو سکا۔ وہ منشی نولکشور نے نواب ضیاء الدین احمد خاں کے صاحبزادے نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے منگوا لیا اور اپنے مطبع میں چھاپنا شروع کر دیا۔ یوں اس کا دوسرا ایڈیشن نومبر ۱۸۶۳ء میں تیار ہو کر مطبع سے باہر آیا۔ چھپنے سے قبل منشی صاحب موصوف نے میرزا سے اقرار کیا تھا کہ آپکو کتاب سوا تین روپیہ نسخہ کے حساب سے دیا جائے گی۔ مگر بعد میں انہوں نے شاید لاگت کی زیادتی کی وجہ سے اس کی قیمت پانچ روپیہ کر دی۔ میرزا یہ قیمت بھی ادا کرنے پر تیار تھے۔ مگر منشی صاحب موصوف نے انہیں سوا تین کے نرخ ہی سے دینا منظور کر لیا اور میرزا اور نواب علاء الدین احمد خاں بہادر دونوں نے دس دس نسخے اسی قیمت پر خریدے۔

کلیات کا دوسرا ایڈیشن اسی مطبع سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اور تیسرا ۱۹۲۴ء میں۔

۶۔ سبد چین ۱۲۸۰ھ میں میرزا نے حکیم غلام رضا خاں صاحب کے اصرار پر مثنوی ابر گہربار کو علیحدہ چھاپنے کی اجازت دیدی۔ حالانکہ وہ کلیات میں شامل تھی۔ یہ نسخہ اکمل المطابع سے شائع ہوا تھا۔ مثنوی کے اس ایڈیشن کے آخر میں دو قصیدے اور دو قطعے جو کلیات کے بعد لکھے گئے تھے اور چند رباعیاں بھی جو کلیات

۵۔ اردو (اورنگ آباد) ۱۹۳۶ء صفحہ ۷۰۴

میں چھپنے سے رہ گئی تھیں شامل کر دی گئیں۔ بعد میں یہ قصائد و قطعات وغیرہ دوسرے کلام کے ساتھ ملا کر سبد چین کے عنوان سے ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ (اگست ۱۸۶۷ء) میں مطبع محمدی سے شائع ہوئے۔ یہ مختصر مجموعہ دوبارہ کہیں سے شائع نہیں ہوا نہ اسے کلیات کے کسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ اس وجہ سے یہ نایاب ہو چکا تھا۔ ابھی حال میں (۱۹۳۸ء) مکتبہ جامعہ نے اسے جید برقی پریس دہلی میں چھپوا کے دوبارہ شائع کیا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ترتیب کلام کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس میں یہ نقص دور کر دیا گیا ہے۔ نیز کلیات نظم و نثر کے علاوہ جتنا کلام اِدھر اُدھر منتشر حالت میں پڑا تھا۔ اسے بھی اکٹھا کر کے اس میں شامل کر دیا ہے۔

ب۔ اردو

۱۔ دیوان اردو

میرزا اگرچہ اردو کلام کو اپنے لئے باعثِ ننگ اور اپنے خاص رنگ سے الگ چیز سمجھتے رہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے ابتدا اردو ہی سے کی تھی اور آج ان کی شہرت کا ایوان اردو دیوان کی بنیادوں ہی پر قائم ہے۔ میرزا کا اردو دیوان غدر سے پہلے دو بار چھپا تھا۔ جب انہوں نے مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی اور دوسرے دوستوں کے مشورہ سے اپنا رنگِ سخن بدلا تو اپنے پہلے کلام کا ایک انتخاب[۱] بھی کیا۔[۲] یہی انتخاب پہلی بار ۱۲۵۷ھ (۴۲-۱۸۴۱ء) میں

---

[۱] میرزا نے اپنے اردو اور فارسی دیوانوں کے دو انتخاب خود کئے۔ ایک مولوی سراج الدین احمد صاحب کی فرمائش پر گل رعنا کے نام سے۔ یہ انتخاب اب نایاب ہے مگر اسکے شروع اور آخر کی فارسی نثریں میرزا کے کلیات نثر میں شامل ہیں۔ دوسرا انہوں نے نواب کلب علی خاں بہادر کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں کیا۔ یہ ریاست رام پور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور مکاتیب غالب کے مرتب نے بشارت دی ہے کہ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ [۲] دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ (باقی صفحہ ۸۵ پر)

فخر المطابع سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ مگر اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کی جو تقریظ تھی۔ وہ آثار الصنادید (سر سید) میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کل ۱۰۷۲ شعر تھے۔

دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔ اس کے آخر میں یہی تقریظ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اس نسخہ میں کل ۱۷۹۲ شعر ہیں۔ اس نسخہ کی ترتیب متداول نسخوں سے مختلف ہے۔ غالباً پہلے ایڈیشن میں بھی اسی طرح ہوگی آغاز میں قطعات ہیں پھر ایک مثنوی اور قصیدے ہیں۔ قصیدوں کے بعد غزلیات ہیں اور سب سے آخر میں رباعیاں۔ آخر میں تیر رخشاں کی فارسی تقریظ اور شروع میں میرزا کا دیبا فارسی دیباچہ ہے۔

مئی ۱۸۵۵ء میں غدر سے چند دن پہلے میرزا نے اپنے دیوان اردو کا ایک نسخہ نواب یوسف علی خاں فردوس مکان کے پاس بھیجا تھا[۵]۔ جب میرزا جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ان سے کہا کہ رام پور والے نسخہ کی ایک نقل لے کر مجھے بھیج دیں۔ کیونکہ ان کا اپنا نسخہ غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ رام پور ہی میں میرزا کو میرٹھ کے ایک شخص عظیم الدین احمد کا خط ملا کہ میں آپ کا اردو دیوان چھاپنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت عطا ہو۔ میرزا نے اس کا کوئی جواب

(بسلسلہ حاشیہ صفحہ ۸۴) جس میں ان کا نظری کلام بھی موجود تھا۔ ریاست بھوپال کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ جہاں سے یہ "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا عبد الباری آسی نے بھی کچھ کلام میرزا کے نام سے چھاپا ہے۔ مگر وہ دراصل غالب کا نہیں۔

[۵] مکاتیب غالب صفحہ ۱

نہ دیا۔ مگر واپسی پر جب وہ میرٹھ میں نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے پاس ٹھیرے تو انہوں نے عظیم الدین احمد کی سفارش کی اور میرزا نے دہلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں سے اردو دیوان کا نسخہ لے کر میرٹھ بھیج دیا۔ تھوڑے دن بعد ان کے دوست اور عزیز منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق آگرہ نے انہیں لکھا کہ آپ نے گھر کا مطبع چھوڑ کر دیوان میرٹھ کیوں بھیجا ہے تو انہوں نے بہ اصرار تمام میرٹھ سے نسخہ واپس منگوا کر اسے منشی شیو نرائن کے پاس آگرے بھیج دیا۔[عا] دیوان ابھی آگرہ میں چھپنا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے دہلی میں مطبع احمدی واقع شاہدرہ کے مالک محمد حسین خاں کو اس کے چھاپنے کی اجازت دیدی۔ مگر یہ نسخہ اتنا غلط سلط چھپا کہ میرزا نے خود ایک نسخہ کی نظر ثانی و تصحیح کر کے مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مذکور کو دیا۔ انہوں نے اس نسخہ کو محمد عبدالرحمٰن خاں مہتمم مطبع نظامی کانپور کے پاس بھیجدیا۔[عا۲] مطبع احمدی کے نسخہ پر تاریخ ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) درج ہے اور مطبع نظامی کے آخر میں ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) گویا ایک برس میں اردو دیوان کے دو ایڈیشن چھپے اور اگر اس دوران میں منشی شیو نرائن نے آگرہ میں مطبع مفید خلائق سے بھی شائع کیا تھا تو تین ہوئے۔

مطبع احمدی دہلی اور مطبع نظامی کانپور کے نسخوں میں ۱۸۵۵ء والے ایڈیشن سے ایک شعر بھی زیادہ نہیں۔ ہاں ترتیب بدل دی گئی ہے۔ یعنی غالب کے فارسی دیباچہ کے بعد غزلیات ہیں۔ ان کے بعد چار قصیدے، دو حضرت علی کی منقبت

[عا] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۸۲

[عا۲] دیکھو عبارت خاتمہ نسخہ مطبوعہ مطبع نظامی کانپور

ہیں اور دو ظفر کی مدح میں۔ اس کے بعد ایک مثنوی صفت انبہ میں اور پھر قطعات اور آخر میں رباعیاں۔

غالب کی زندگی میں اردو دیوان کا اور کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

۲۔ عودِ ہندی

میرزا کے اردو خطوط جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خاں صاحب میرٹھی کو ہوا۔ انہوں نے مارہرہ کے چودھری عبدالغفور سرور سے کہا کہ آپ وہ خطوط عنایت فرمائیں، جو آپ کے پاس ہیں۔ سرور نے نہ صرف اپنے خط دیئے بلکہ وہ بھی جو صاحبِ عالم اور شاہ عالم صاحبان کے نام تھے۔ ان ۱۳۱ خطوط پر ایک دیباچہ لکھا، جس میں تاریخ کا قطعہ تھا۔

انشا مملو بصد مطالب لکھی ۔۔۔ یعنی پئے دوستانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو "مہرِ غالب" سے سرور ۔۔۔ تاریخ بھی اس کی "مہرِ غالب" لکھی[عــ۵]
۱۲۸۷ھ

اور یہ سارا مجموعہ جناب ممتاز علی خاں صاحب کے حوالے کر دیا۔ بعد میں ممتاز علی خاں صاحب کو خیال آیا کہ اگر کوشش اور تلاش کی جائے تو بعض دیگر حضرات سے بھی خطوط بہم پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سرور والے مجموعہ کی اشاعت ملتوی کر دی اور خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کی مدد اور وساطت سے ۱۳۰ خطوط اور جمع کیے۔

عــ۵ "ادبی خطوطِ غالب" کے فاضل مؤلف جناب مرزا محمد عسکری صاحب کو اس تاریخ سے یہ شبہ ہوا کہ "عودِ ہندی" سب سے پہلے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ (صفحہ ۷) حالانکہ اور تمام قرائن کو چھوڑ کر نامہ غالب کی اس میں شمولیت ہی ایسی زبردست شہادت تھی کہ ان کے اس خیال کی تردید کرنے کیلئے کافی تھی۔ کیونکہ یہ خط ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا۔ انہیں اردوئے معلیٰ کے متعلق بھی غلط فہمی ہوئی جو انہوں نے لکھا ہے کہ یہ میرزا کی زندگی میں چھپ چکی تھی۔ (صفحہ ۹)

ان کے علاوہ انہوں نے چند تقریظیں اور نثریں بھی حاصل کیں ۔ان سب کا مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے اول بار مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۲ رجب ۱۲۸۵ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو (یعنی میرزا کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے) شائع ہوا۔ اگرچہ تمام مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا۔[1]

۳۔ اردوئے معلّٰی

عودِ ہندی کی ترتیب ۱۸۶۱ء میں شروع ہو چکی تھی۔ مگر خطوط کے جمع کرنے میں اتنا وقت صرف ہوا کہ اس کے چھپنے میں بہت دیر ہو گئی۔ دوستوں کی طرف سے تقاضا شروع ہوا تو میرزا نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو لکھا کہ آپ کے پاس جتنے خطوط ہیں۔ ان کی ایک نقل مجھ کو بھیج دیں۔ لکھتے ہیں:[2]

> "اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کہا کرتے ہیں۔ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔"

---

[1] "عودِ ہندی کی ترتیب" کے عنوان سے ایک نہایت اعلیٰ مضمون پنڈت ہیش پرشاد صاحب کے قلم سے الہ آباد کے رسالہ "ہندستانی" کی اشاعت اکتوبر ۱۹۳۵ء میں چھپا تھا۔ عودِ ہندی کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسی مضمون سے ماخوذ ہے۔

[2] عودِ ہندی صہ ۱۲۹

بات اصل میں یہ ہے کہ جب منشی ممتاز علی خاں صاحب کی طرف سے خطوط کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہوئی تو میرزا نے سمجھا کہ انہوں نے چھاپنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اس پر میرزا کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے اکمل المطابع کے مہتمم میر فخرالدین صاحب کے ساتھ مل کر خطوط جمع کرنا شروع کئے کہ انہیں اس مطبع میں چھاپا جائے۔ میرزا نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو اپریل یا مئی ۱۸۶۳ء میں خط لکھا[۵۱]

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کئے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہونگے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی اِدھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود میرزا نے بھی دوستوں سے خطوط جمع کر کے مرتب کے پاس بھیجے تھے۔ گویا وہی کام جو پانچ برس پہلے انہوں نے منشی شیو نرائن کے کہنے پر نہیں کیا تھا اور یہ کہہ کر ٹال دیا تھا[۵۲]

"کیا ضرور کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان (خطوط) کا چھاپنا میرے خلافِ طبع ہے۔"

---

۵۱ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۴

۵۲ ایضاً صفحہ ۲۶۸

اب خود سرگرمی سے اس میں حصہ لینے لگے تھے۔ آخر یہ مجموعہ مارچ ۱۸۶۹ء میں اردوئے معلّٰی کے نام سے چھپا۔ مگر افسوس کہ میرزا کو اس کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ وہ اس سے پہلے فروری میں وفات پا چکے تھے۔ مرزا قربان علی بیگ خاں سالک نے تاریخ کہی۔

لب پہ نالوں کا اژدحام ہوا	کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا
سببِ رنجِ خاص و عام ہوا	صدمۂ مرگِ حضرتِ غالب
آج اون کا سخن تمام ہوا	ہے یہی سالِ طبع، سالِ وفات

۴۔ مکاتیب غالب میرزا کی دربار رام پور سے ۱۲۸۵ھ بارہ برس خط و کتابت رہی۔ جنوری ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۶۵ء تک نواب فردوس مکان کے ساتھ اور اس کے بعد فروری ۱۸۶۹ء تک نواب خلد آشیاں کے ساتھ۔ یہ تمام خطوط ریاست رام پور کے دارالانشاء میں محفوظ تھے۔ ابھی حال میں[۱] ان تمام خطوط کا مجموعہ مولانا امتیاز علی عرشی ناظم کتب خانہ ریاست مذکور نے نہایت اہتمام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں ۱۰۷ خطوط دونوں والیانِ ریاست کے نام ہیں اور ۸ خط رام پور کے بعض اور حضرات کے نام۔ شروع میں مرتب نے ایک بسوط دیباچہ لکھا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں سب سے زیادہ قیمتی چیز حاشیہ میں ان خطوط کی نقلیں ہیں۔ جو ریاست کی طرف سے میرزا کی تحریرات کے جواب

---

[۱] 'مکاتیب غالب' پر تاریخ اشاعت ۱۹۳۷ء درج ہے۔ بلاشبہ کتاب کی طباعت ۱۹۳۷ء میں ہوئی ہے۔ مگر دراصل یہ فروری ۱۹۳۸ء میں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچی۔ اگرچہ جنوری میں چند نسخے بعض حضرات کو تبصرہ وغیرہ کے لئے بھیج دئے گئے تھے۔ بہرحال اس کی اشاعت ۱۹۳۷ء کی جگہ ۱۹۳۸ء میں لکھنا زیادہ درست تھا۔

میں بھیجے گئے تھے۔

ابھی خطوط کی بہت بڑی تعداد غیر مطبوعہ پڑی ہے۔ پنڈت مہیش پرشاد صاحب (ہندو یونیورسٹی بنارس) کے پاس ایک عدیم المثال ذخیرہ ہے سلے کاش کہ وہ جلد اس کی اشاعت کا انتظام کریں۔

۵۔ نکات غالب و رقعات غالب

جس زمانہ میں میجر فلر پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ انہوں نے علوم شرقیہ کی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ کئی حضرات کو اپنے پاس لاہور میں بلوالیا اور ان سے کتابیں لکھوائیں۔ جو نہیں آسکتے تھے ان سے فرمائش کرکے کتابیں تصنیف کرائیں۔ جو لوگ لاہور میں انکی دعوت پر پہنچے انہیں ایک جناب رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب تھے۔ میرزا غالب انہیں ہمیشہ اپنے بیٹوں کی طرح سمجھا کئے۔ رائے بہادر موصوف نے میجر فلر کے حسب الحکم میرزا سے درخواست کی کہ طلبا کیلئے فارسی زبان کی صرف کے قواعد لکھیں۔ اسپر میرزا نے دو مختصر رسالے مرتب کئے۔ نکات غالب میں یہ قواعد ہیں اور رقعات غالب میں ان کے ۱۵ فارسی مکتوبات ہیں جو انہوں نے پنج آہنگ کے آہنگ پنجم سے انتخاب کرکے دئے ہیں۔ دونوں چیزیں ۴۰ صفحات کو محیط ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جس میں صرف پانسو نسخے تھے، فروری ۱۸۶۷ء میں محمد سعادت علی خاں صاحب کے مطبع سراجی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد دوبارہ یہ رسالہ کہیں سے شائع نہیں ہوا۔

۶۔ قادر نامہ

میرزا نے عارف کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی تعلیم کے لئے ۸ صفحہ کا ایک مختصر منظوم رسالہ قادر نامہ تصنیف کیا تھا۔[ے]

ے؎ بہ روایت مولوی عبدالحق صاحب نے میر افضل علی عرف میرن صاحب (باقی صفحہ ۹۲ پر ملاحظہ ہو)

اس میں خالق باری اور آمد نامہ کی طرز پر اردو اور فارسی لغات ہیں شعر اول ہے[5]

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

کل اشعار کی تعداد ۱۳۲ ہے۔ اس میں بارہ شعر دو غزلوں کے شامل ہیں۔ جو قادر نامہ ہی کا حصہ ہیں۔ آخر میں ۴ شعر کا ایک قطعہ ہے۔

قادر نامہ کا پہلا ایڈیشن یکم اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مطبع منشی مداری لال (لاہور) سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن چھپے ہیں۔

ج۔ قاطع برہان کا مباحثہ

محرق قاطع اور اسکے جواب میرزا نے جب ۱۸۶۲ء میں "قاطع برہان" شائع کی تو ہندوستان کے فارسی دانوں کے حلقہ میں گویا ایک بھونچال آگیا۔ بقول غالب "معتقدان برہان قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے" سب سے پہلے اس کے جواب میں سید سعادت علی صاحب نے ایک کتاب "محرق قاطع برہان" لکھی[6]۔ اس کے جواب میں غالب کے طرفداروں نے تین رسالے لکھے۔ اول

(بسلسلہ حاشیہ صفحہ ۹۱) کی زبانی لکھی ہے (اردو ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۰۰) بعض اصحاب کو اس میں کلام ہے کہ یہ رسالہ غالب کی تصنیف نہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی اس شہادت سے قطع نظر خود قادر نامہ میں بعض ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی یہ میرزا کی تصنیف ہے۔"

۶ محرق قاطع برہان، ۹۶ صفحہ کی کتاب فارسی زبان میں ہے۔ یہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں مطبع دہائی شاہدرہ میں چھپی۔ اس کے مصنف سید سعادت علی صاحب پہلے رزیڈنٹ راجپوتانہ کے دفتر میں میر منشی تھے۔ پنشن لینے کے بعد دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔

'دافع ہذیان'۔ اس کے مصنف ایک صاحب مولوی نجف علی تھے۔[۵۱] دوم 'لطائف غیبی' جس کے مصنف میاں داد خاں سیاح کہے جاتے ہیں[۵۲] اور سوم سوالات عبدالکریم[۵۳]

ساطع برہان قاطع برہان کے جواب میں دوسری کتاب 'ساطع برہان' لکھی گئی۔[۵۴] اس کے مصنف میرزا رحیم بیگ صاحب میرٹھی تھے۔ وہ شیخ امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ میرٹھ میں مکتب پڑھاتے تھے آخر عمر میں ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔

---

[۵۱] 'دافع ہذیان' (فارسی) ۲۸ صفحہ کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ یہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے مصنف سید محمد نجف علی خاں ابن سید محمد عظیم الدین تھے۔ عربی اور فارسی زبان کے فاضل تھے۔ غالباً جھجر کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے دساتیر کی ایک فرہنگ بھی ۱۸۶۴ء میں لکھی تھی۔ اس کے آخر میں میرزا کی ایک تقریظ فارسی زبان میں موجود ہے۔ جو ان کی کلیات نثر میں شامل نہیں ہے۔

[۵۲] 'لطایف غیبی' (اردو) آٹھ صفحہ کا رسالہ ہے۔ اس کے مصنف میاں داد خاں سیاح کہے جاتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں یہ میرزا کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے آگے لکھا گیا ہے۔

[۵۳] سوالات عبدالکریم' (اردو) آٹھ صفحہ کا ایک مختصر رسالہ اکمل المطابع دہلی سے ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا۔ اس میں کل سترہ سوال ہیں۔ میرے خیال میں یہ رسالہ بھی غالب کا لکھا ہوا ہے۔ یا کم از کم اس کی تصنیف میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔

[۵۴] 'ساطع برہان' (فارسی) ۴۷ صفحات کی کتاب ہے۔ یہ ۱۲۸۳ھ میں مطبع ہاشمی سے شائع ہوئی تھی۔

۷۔ نامۂ غالب (اردو) یہ کتاب انہوں نے بعض دوستوں کے اصرار پر لکھی تھی۔ اس کتاب کے جواب میں میرزا نے خود ۱۶ صفحہ کا ایک خط 'نامۂ غالب' کے نام سے لکھا، اور اپنے خرچ پر اس کے تین سو نسخے چھپوا کر دور نزدیک دوستوں میں تقسیم کردئے[۵۱]۔ یہ سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی (محمد مرزا خاں) دہلی میں چھپا۔ میرزا نے اس کے ۵ نسخے نواب صاحب رام پور کو بھیجے تھے۔ ان کی اطلاع انہیں ۱۴ اگست ۱۸۶۵ء کے خط میں دی ہے[۵۲]۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نامۂ غالب۔ اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد یہ خط اسی سال اودھ اخبار کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر اور ۱۷ اکتوبر) میں بھی چھپا تھا[۵۳]۔ اس وقت یہ عود ہندی میں شامل ہے۔

قاطع القاطع و موید برہان قاطع برہان کے جواب میں دو کتابیں اور لکھی گئیں۔ ایک قاطع القاطع[۵۴] جس کے مصنف امین الدین امین تھے۔ وہ پٹیالہ میں مدرس تھے اور غالب کا رہنے والے بھی وہیں کے تھے۔ دوسری کتاب موید برہان[۵۵]

---

[۵۱] اردوئے معلی صفحہ ۱۹-۲۰

[۵۲] مکاتیب غالب صفحہ ۵۸

[۵۳] رسالہ ہندستانی (الہ آباد) ۱۹۳۴ء صفحہ ۱۰۶

[۵۴] قاطع القاطع (فارسی)۔ یہ کتاب ۱۲۸۳ھ مطبع مصطفائی سے شائع ہوئی تھی۔ ۶۸ صفحے ہیں۔

[۵۵] موید برہان (فارسی)۔ یہ اس سلسلہ کی سب سے مبسوط کتاب ہے۔ ٹائپ میں مطبع مظہر العجائب کلکتہ سے چھپی تھی۔ ۲۸۴ صفحات کو محیط ہے۔ سن طباعت ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) ہے۔

تھی۔ اس کے مصنف مولوی آغا احمد علی احمد تخلص تھے۔ مولوی احمد علی صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ میں فارسی زبان کے مدرس تھے۔ انکے اجداد اصفہانی الاصل تھے۔ لیکن ایک زمانہ سے نقل مکان کرکے ہندوستان میں چلے آئے تھے۔ مولوی احمد علی صاحب کا مولد ڈھاکہ (جہانگیر نگر) تھا۔ اس لئے مولوی احمد علی جہانگیر نگری کے نام سے مشہور تھے۔ میرزا نے ان کی کتاب دیکھنے سے پہلے ایک قطعہ فارسی[۵] زبان میں لکھ کر انہیں بھیجا جس کا پہلا شعر ہے:

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ

درخصوصِ گفتگوئے پارسی انشا کردہ است

۸۔ تیغ تیز اس کے بعد میرزا نے ایک رسالہ اردو زبان میں لکھا اور اس کا نام تیغ تیز رکھا۔ اس میں سترہ فصلیں ہیں۔ پہلی سولہ فصلوں میں ایک ایک اعتراض مولوی احمد علی صاحب پر کیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے اعتراض کا جواب بھی دیا ہے۔ آخری فصل میں برہان قاطع پر مزید اعتراضات ہیں۔ آخر میں سولہ ادبی سوالات کا استفتاء ہے۔ جن کے جواب نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم نے دئے ہیں اور مولانا حالی۔ مولوی محمد سعادت علی خاں صاحب اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں تینوں حضرات کی ان جوابات کے بارے میں تصدیق و تائید ہے۔ یہ رسالہ مطبع اکمل المطابع سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ دوبارہ نہیں چھپا۔

---

[۵] یہ قطعہ سبد چین میں شامل ہے پہلے یہ علیحدہ بھی اکمل المطابع سے ۱۲۸۲ھ میں چھپا تھا۔

ہنگامہ دل آشوب | میرزا کے متذکرہ صدر قطعہ کے جواب میں مولوی احمد علی صاحب کے ایک شاگرد مولوی عبدالصمد فدا متوطن سلہٹ نے اسی زمین میں ایک قطعہ لکھا۔ اس کا آغاز یوں ہے ؎

فرقِ حق و باطل اے صاحب نظر بشنوز من
گر ترا جو یائے حق ایزد تعالیٰ کردہ است

اس قطعہ کے جواب میں میرزا غالب کے دو شاگرد میدان میں اترے۔ اول سید محمد باقر علی باقر دوم خواجہ سید فخر الدین حسین سخن۔ ان دونوں کے قطعے بھی اسی زمین میں ہیں۔ ان چاروں قطعوں کا مجموعہ منشی سنت پرشاد کے مطبع واقعہ آرہ (ضلع شاہ آباد) سے ۵ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ (۱۱ اپریل ۱۸۶۷ء) کو چھپا اور "ہنگامہ دل آشوب" اس کا نام ہوا۔

تیغ تیز تر | اس پر عبدالصمد صاحب فدا نے باقر اور سخن کے دونوں قطعوں کا جواب لکھا اور پہلے چاروں قطعوں کے ساتھ اس پانچویں قطعہ کو ملا کر اس مجموعہ کا نام "تیغ تیز تر" رکھا۔ یہ رسالہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں غلام نبی خاں کے مطبع نبوی سے شائع ہوا۔

ہنگامہ دل آشوب حصہ دوم | اس کے بعد ایک شخص منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص لکھنوی شاگرد ناطق مکرانی نے ایک قطعہ لکھا جس سے آغا احمد علی کی حمایت اور میرزا غالب کی مخالفت مقصود تھی۔ اگرچہ ان دونوں باتوں کا اظہار کھلے بندوں نہیں تھا۔ اس پر باقر اور سخن نے جوہر اور فدا دونوں کے قطعوں کا ایک ایک جواب لکھا۔ اسی دوران میں میر آغا علی صاحب شمس لکھنوی نے اودھ اخبار کی اشاعت

۲۵ جون ۱۸۶۷ء میں ایک مضمون لکھا جس میں میرزا کے بعض اشعار پر ایرادات گئے اس کا جواب سخن نے اردو نثر میں اور باقر نے فارسی نثر میں لکھا۔ ایک صاحب منشی محمد امیر آمیر لکھنوی نے غالب کی حمایت میں اردو قطعہ لکھ کر اودھ اخبار میں چھپوایا۔ ان پانچوں قطعوں اور دونوں مضامین نثر کا مجموعہ منشی سنت پرشاد کے مطبع سے ہنگامہ دل آشوب حصہ دوم کے نام سے ۵ رجمادی الاول ۱۲۸۴ھ (۵ ستمبر ۱۸۶۷ء) کو شائع ہوا[۱]۔ منشی محمد آمیر صاحب کے قطعہ کے علاوہ جو اردو میں ہے۔ باقی تمام قطعات اُسی ایک زمین میں لکھے گئے یعنی انشا کردہ است۔ تقاضا کردہ است شمشیر تیز تر لیکن یہ سب شاعری ہی شاعری تھی۔ میرزا غالب نے جو اعتراض تیغ تیز میں کیے تھے۔ ان کا جواب نہیں ہوا تھا۔ مولوی احمد علی صاحب نے ان اعتراضات کے جواب فارسی زبان میں لکھے اور اس رسالہ کا نام "شمشیر تیز تر" رکھا۔ اس کے آغاز میں "تیغ تیز تر" کے پانچوں قطعے بھی ہیں۔ اور اس کے بعد ۱۰۵ صفحہ کی نثر ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا[۲]۔ یہ اس سلسلہ کی آخری تحریر ہے۔ گویا وہ ہنگامہ جو قاطع برہان کی اشاعت سے ۱۸۶۲ء میں شروع ہوا تھا شمشیر تیز تر کے ساتھ ۱۸۶۸ء میں ختم ہوا۔

---

[۱] ہنگامہ دل آشوب کے دونوں حصے تمام وکمال رسالہ اردو کی اشاعت جنوری ۱۹۳۷ء میں چھپ گئے ہیں۔ ہماری معلومات اسی مضمون سے ماخوذ ہیں۔

[۲] رسالہ "شمشیر تیز تر" میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ مکرمی مولانا غلام رسول مہر کے ایک خط سے ماخوذ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اس ذخیرے میں ہے جو مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کا عطیہ ہے۔

د۔ لطائف غیبی کا مصنف

"لطائف غیبی" ۱۸۶۵ء میں سید سعادت علی صاحب کی کتاب "محرق قاطع برہان" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس پر مصنف کا نام میاں دادخاں سیاح لکھا ہے۔ مگر یہ محض مغالطہ ہے۔ اصل میں کتاب غالب کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے لئے کئی داخلی اور خارجی دلایل ہیں۔

(۱) میرزا ایک خط میں میاں دادخاں سیاح کو لکھتے ہیں ع۵:

"تمہیں جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے۔ اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو۔ تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہیگی۔ لطائف غیبی نے اعداء کی دھجیاں اڑا دیں۔"

اس خط میں دراصل اشارہ ہے خود لطائف غیبی کی طرف۔ اس کے آغاز ہی میں یہ عبارت ہے:

"سیاح بحر و بر ہیچمدان بے ہنر سیف الحق میاں دادخاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔"

اگر کتاب خود سیاح کی لکھی ہوتی تو وہ سیف الحق کیسے لکھتے جب کہ غالب نے یہ خطاب انہیں بعد میں دیا تھا۔ فی الحقیقت غالب نے کتاب لکھ کر ان سے منسوب کی اور لکھا کہ میں نے سیف الحق تمہیں خطاب دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے۔ میرزا کے خط کے اس اقتباس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کلام میرا ہوگا۔ مگر وہ تمہارے ہاتھ سے لکھا اور شائع کیا جائے گا۔ یعنی میں اپنی تحریر

ع۵ اردوئے معلی صفحہ ۱۳

اپنے نام سے شائع نہیں کروں گا۔

(۲) جن دنوں لطایف غیبی چھپی ہے۔ انہیں دنوں میرزا نے ایک اعتراض قتیل کے کلام پر لکھا اور اخبار میں سیاح کے نام سے چھپوا دیا۔ اس سے بھی اس بیان کی توثیق ہوتی ہے کہ "میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔" میرزا لکھتے ہیں[۱]

"محمد مرزا خاں میرے سبھی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے۔ مسمیٰ بہ اشرف الاخبار۔ اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کرلو گے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔"

(۳) لطائف غیبی میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اگر یہ تصنیف خود سیاح کی تھی۔ تو جو نسخے سیاح کے پاس بھیجے گئے تھے۔ وہ ان کو خود درست کر سکتے تھے۔ غالب کو یا کسی اور شخص کو انہیں اغلاط بتانے کی ضرورت جبھی پیش آ سکتی تھی کہ یہ کتاب کسی اور کی لکھی ہوتی۔ میرزا ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں[۲]

"یہ ایک پارسل جو بعد ان دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے اس میں وہی لطائف غیبی ہے جس کو میں نے اپنے مطالعہ میں رکھکر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تینوں رسالوں کو اس کے مطابق درست کرلو۔"

اس سے عیاں ہے کہ کتاب میرزا نے لکھی تھی اور وہ اب اس کی اغلاط درست کر کے

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳

[۲] ایضاً صفحہ ۱۶

سیاح کو بھیج رہے ہیں۔

(۴) لطایفِ غیبی کی عبارت ہے:-[۵۱]

"مجھ کو توحمیت اور رعایتِ حق اس تحریر کی باعث ہوئی تاکہ میں نے بیس۲۰

لطائف جمع کئے اور اس نگارش کا لطائف غیبی نام رکھا۔

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ سیاح تو "درپسِ آئینہ طوطی صفت" بیٹھے ہیں۔ "استادِ ازل" (غالب) جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ دہرا رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں تو کتاب کا نام لطایف غیبی بجائے خود غمازی کر رہا ہے کہ ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

ان شہادتوں کے علاوہ سب سے بڑی داخلی شہادت لطایف غیبی کا اسلوبِ بیان وطرزِ تحریر ہے۔ جیسا کہ مولانا مہر نے لکھا ہے[۵۲] "عبارت کی روانی اور اعتراضات کی شوخی میں غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سیاح اس انداز کی عبارت نہیں لکھ سکتے تھے اور ان کی "سیر سیاح" جو غالباً ۱۸۷۲ء میں چھپی تھی۔ اس امر کی گواہ ہے کہ ان کا اندازِ تحریر "لطایف غیبی" سے بالکل مختلف تھا۔"

غرضکہ ہم ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی فیصلہ پر پہنچے ہیں کہ "لطایف غیبی" میرزا کی تصنیف ہے۔ میاں دادخاں زیادہ سے زیادہ جامع کی حیثیت

---

[۵۱] لطایف غیبی ص۳

[۵۲] غالب (مہر) ص۲۴۱

رکھتے ہیں۔ جیسا کہ "درفش کاویانی" کے آخر میں سیاح کی تاریخ کا عنوان بھی "جامع لطائف غیبی" ہی۔ یہی حال "سوالات عبد الکریم" کا ہے۔ یہ آٹھ صفحہ کا مختصر رسالہ بھی بیرتا کے رشحِ قلم کا ممنونِ احسان ہے۔ جسے انہوں نے عبد الکریم کے نام سے شائع کیا۔

غالب کی حسرتیں

غالب نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں چار کتابیں فارسی نثر میں اور دو نظم میں لکھیں۔ اردو میں ان کا سرمایہ ایک مختصر دیوان اردو کا اور خطوط کے مجموعوں کے علاوہ دو تین اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ساٹھ سال کے طویل زمانہ کی یہ پیداوار کچھ زیادہ قابلِ تعریف یا مہتم بالشان نہیں۔ اس کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ مگر زمانہ کی نامساعدت اور ابنائے دہر کی ناقدری نے ان کے تمام ولولوں کو سرد کر دیا۔ وہ خود کہتے ہیں[1] کہ "میں زمانہ سے زیادہ نہیں تھوڑی سی آسائش اور طمانیت قلب چاہتا تھا۔ اگر یہ مجھے میسر آجاتی تو میں فکر کی قوت سے اربابِ فن سے داد حاصل کرتا"۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ اس پریشان حالی میں بھی لکھا اور صفحۂ قرطاس پر جو نقشِ جاوداں بنائے ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کس نے کیا۔ اور اس کی صحیح داد بھی انہیں کب ملی۔ انہوں نے بالکل سچ لکھا ہے[2]۔

"پنجاہ و دو سال مغزِ سخن کاوتم، امروز کہ شصت و ششین سال از عمر گذراں می گزرد، سخن آفریں را سپاس گزارم و ہم جز آں بخشندۂ بخشائش گر کس

---

[1] درفش کاویانی صفحہ ۷

[2] ایضاً صفحہ ۱۳۱-۱۳۲

نیازرو دانست کہ دریں پنجاہ و دو سال چہ دُرہائے معنی بروئے من کشادہ اند، وکرسیٔ اندیشۂ مراد رفراز سنانِ آگہی بکدام پایہ نہادہ اند، حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتارِ مرا نشناختند، مرا خود دل برآنان می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند، گوئی نظیری ہمدردِ من و مقطعِ آں بینوا آرامشگاہ نوائے سازِ دمِ سردِ من است ؎

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ



ہمارے مآخذ

کلیاتِ نثرِ فارسی (غالب)	طبع اوّل	نولکشور پریس لکھنؤ	سنہ ۱۸۶۸ء
درفشِ کاویانی (غالب)	طبع اوّل	اکمل المطابع دہلی	سنہ ۱۸۶۵ء
تیغِ تیز (غالب)	طبع اوّل	اکمل المطابع دہلی	سنہ ۱۸۶۷ء
لطایفِ غیبی (غالب)	طبع اوّل	اکمل المطابع دہلی	سنہ ۱۸۶۴ء
اردوئے معلّیٰ (غالب)	بار اوّل	مطبع کریمی لاہور	سنہ ۱۹۲۲ء
عودِ ہندی (غالب)	بار سوم	نولکشور پریس لکھنؤ	سنہ ۱۹۲۵ء
مکاتیبِ غالب (مرتبہ امتیاز علی عرشی)	طبع اوّل	قیمہ پریس بمبئی	سنہ ۱۹۳۷ء
ادبی خطوطِ غالب (مرتبہ میر محمد عسکری)	طبع دوم	انوار المطابع لکھنؤ	سنہ ۱۹۳۳ء
یادگارِ غالب (حالی)	طبع سوم	کریمی پریس لاہور	سنہ ۱۹۳۰ء
غالب (مولانا غلام رسول مہر)	طبع اوّل	مسلم پرنٹنگ پریس لاہور	سنہ ۱۹۳۶ء
غالب نامہ (مسٹر محمد اکرام)	طبع اوّل	مسلم گجرات پریس سورت	سنہ ۱۹۳۷ء
واقعاتِ دارالحکومت دہلی (مولوی بشیر الدین احمد)	طبع اوّل	شمسی مشین پریس آگرہ	سنہ ۱۹۱۹ء
چراغِ دہلی (میرزا حیرت)	طبع اوّل	کرزن پریس دہلی	سنہ ۱۹۰۶ء

(مطبوعہ جیّد برقی پریس، دہلی)

جرمنی کی طباعت اور ہندوستان کے تخیل کا کمال

دیوانِ غالب

(مطبوعہ جرمنی برلن)

جس میں مرزا غالب کی تصویر
ایک جرمن مصور کے موقلم سے
زیب عنوان ہے

قیمت

عہ/

مکتبہ جامعہ دہلی